

# بَارِئٌ مَحَلِّسٌ

عَلَّامٌ السَّيِّدُ ذِي الشَّانِ حَيْدَرُ جَوَادِي

# فہرستِ مجالس

صفحہ نمبر	مصائب	موضوع	نمبر شمار
۵	مدینہ سے روانگی	شخصیتِ امام حسین علیہ السلام	۱
۱۶	جناب ام سلمہ سے رخصت	انسانی رشتے اور عبدیت	۲
۳۰	حضرت حُرّ ۴	ضمانتِ کردار	۳
۴۴	حضرت وہب ۲	اسلوبِ کلام پر بحث	۴
۶۰	فرزندِ مسلم بن عوف ۲	تقسیمِ بشریت و رسالت	۵
۷۶	حضرت حبیب ۲	مفہوم رسالت و نبوت و امامت	۶
۹۴	حضرت قاسم ۲	مفہوم محمدیت	۷
۱۱۰	حضرت علی اصغر ۴	کردارِ قبلِ نبوت (قبل از بعثت)	۸
۱۲۵	حضرت عباس ۲	عرفانِ رسول	۹
۱۴۲	حضرت علی اکبر ۲	ضرورتِ رسالت	۱۰
۱۵۹	حالاتِ شبِ عاشور	شعورِ کائنات	۱۱
۱۷۳	شامِ غریباں	قربانیِ آلِ محمد	۱۲

نام کتاب . . . بارہ مجلسیں

مجموعہ تقاریر . . . علامہ الیڈ ذیشان حیدر جوادی

عنوان . . . عرفان رسالت

✱ اشاعتِ اول (پاکستان میں) ۱۹۸۸ء

✱ تعدادِ اشاعت . . . ایک ہزار

ناشر . . . احمد بک ڈپو

رضویہ سوسائٹی کراچی ۱۸ء

کتابت . . . سید جعفر زیدی

ملنے کا پتہ

احمد بک ڈپو رضویہ سوسائٹی کراچی ۱۸ء

## باسمہ سبحانہ

اس کتاب میں بارہ مجلسیں آیامِ محرم کی مناسبت سے درج کی گئی ہیں، اور اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ ان کا مطالعہ کرنے والا سرکارِ دو عالم کی مکمل حیاتِ طیبہ پر ایک نظر پیدا کر لے۔ یہ کتاب نہ اعلیٰ درجہ کے فاکرینِ کرام کے لیے ہے اور نہ بالکل مبتدی افسراد کے لیے۔

اس میں اوسط درجہ کے اہل علم کی رعایت کی گئی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ نذرانہِ حقیر بارہ گاہِ معصومین علیہم السلام میں قابلِ قبول ہوگا، اور افسرادِ قوم بھی مرکزِ توجہ بنائیں گے۔

جوادی

## ①

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ •  
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ •

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ  
الْمُرْسَلِينَ وَخَاتَمِ النَّبِيِّينَ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا أَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ  
الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ وَاللَّعْنَةُ الدَّائِمَةُ عَلَى أَعْدَائِهِمْ إِلَى يَوْمِ  
الدِّينِ أَمَا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ  
” وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ “

اے اہلِ عزا! عزا کے دن آپہنچے۔ غم کی راتیں بکا کے دن آپہنچے  
آسمان پر محمد کا چاند نمودار ہو چکا ہے۔ یہ چاند اپنے ساتھ بیشمار یادیں لیکر آیا ہے  
اس کی ہر یاد ایک خاص تاثر رکھتی ہے اور اس کی ہر یاد کے ساتھ انسانی  
زندگی کا ایک مسئلہ وابستہ ہے۔

یہ چاند مختلف منزلیں طے کر کے منظرِ عام پر آیا ہے اور یہ پیغام لایا ہے  
کہ اسی طرح ۱۱۰۰ھ میں فاطمہ کا چاند سفر کی مختلف منزلیں طے کر کے  
کر بلا کے اُفق پر طالع ہوا تھا۔

یہ چاند اپنے ضعف و اضحلال سے یہ خیر سنار ہلے کہ حسینی قافلہ میں  
کچھ نیم جاں بچے بھی تھے جو کانِ سفر سے اسی طرح مضحکل اور کمزور ہو گئے تھے

یہ چاند اپنی ساخت و وضع سے اس یاد کو تازہ کر رہا ہے کہ کل کر بلا کے میدان میں آل رسول کے دشمن، ذریت پیغمبر کے خون کے پیاسے بھی اسی طرح نیام میں خنجر چھپا کر لائے تھے اور قاطعہ کے لال کا خون بہانا چاہتے تھے۔

یہ چاند سبھی سال کا پہلا چاند ہے جو اسلامی تاریخ کے پڑھنے والوں کو اس واقعہ ہجرت کی یاد دلارہا ہے جب خدا کے رسول نے دشمنوں کے مظالم و مصائب سے تنگ آکر بحکم خدا اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ کا رخ کیا تھا۔ لیکن ارباب عزا! اسلام کی تاریخ کا یہ عجیب الم انگیز اور حیرت فزا واقعہ ہے کہ ساٹھ سال پہلے نبی اکرم نے اپنا وطن چھوڑا تو مدینہ نے بڑھ کر آپ کا استقبال کیا اور اپنی آغوشِ محبت میں آپ کو جگہ دی۔ مدینہ آپ کے لیے دارالہجرت ہی نہیں بلکہ دارالامن بھی بنا، اور ساٹھ سال نہیں گزرنے پائے تھے کہ اسی مدینہ نے نبی کے لال کو پناہ دینے سے انکار کر دیا اور حسین کو دینِ خدا کی خاطر مدینہ چھوڑ دینا پڑا۔

تاریخ عالم میں اس انقلاب کی مثال نہیں مل سکتی کہ نبی کریم نے مگر چھوڑ کر مدینہ کا رخ کیا تھا اور حسین نے ۲۸ رجب کو مدینہ چھوڑ کر مکہ کا رخ کیا۔ کربلا کے فلسفہ پر نظر کرنے والے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ امت اسلامیہ نے نصرتِ صدی کے اندر کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا اور حالات میں کس قدر فرق پیدا ہو گیا تھا کہ نبی کا دارالہجرت حسین کی پناہ گاہ نہ بن سکا۔

یہ حسین ۲۸ رجب کو مدینہ نہیں چھوڑ رہے تھے، نانا کے کلمہ پڑھنے والوں اور اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے ذہنوں کو ان تلخ حقیقتوں کی

طرف موڑ رہے تھے جن کی طرف توجہ یزیدیوں کے کردار کو بے نقاب کرنے میں مکمل مدد دے سکتی ہے، اور یہ بتا سکتی ہے کہ فاطمہ کے لال نے اپنے وطن عزیز کو کیوں چھوڑا اور حسینؑ کو بلاکن حالات میں گئے۔

یزید اور یزیدیت کے پرستار آج بھی یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ یزید نے اسلام میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور اس کا دین بعینہ پیغمبر کا دین تھا لیکن حسینؑ نے روزِ اول ہی اس پروپیگنڈہ کی قلعی کھول کر رکھ دی اور یہ واضح کر دیا کہ جو انسان نبیؐ کے لال کو اس کے وطن میں خاموش نہ بیٹھے وہ اسلام کو اس کے اصل مرکز پر کھینک کر برداشت کر سکتا ہے جب کہ نواسہ رسولؐ خاموش ہے اور اسلام قدم قدم پر یزید کے کردار پر تنقید کر رہا ہے۔

محرم کے اس چاند کے ساتھ روئے زمین کے گوشے گوشے پر صرف عزا بچھ گئی ہے اور رسولؐ کو ان کے لال کا پُرسہ دینے والے مسلمان اور انسانیت کو اس کی قدروں کی بربادی پر تعزیت پیش کرنے والے انسان سب اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔ مسلمانوں کے آئسوا اس بات پر بہہ رہے ہیں کہ اُمت نے اولادِ رسولؐ کی قدر نہ پہچانی۔ حسینؑ کو کربلا میں بلا کر شہید کر دیا اور دنیا کے دوسرے انسان اس بات پر اشد کبار ہیں کہ انسانیت کے دشمنوں نے انسانیت کے مرقع کو خاک میں ملا دیا، اور حسینؑ سے ملنے والے انسانی درس کا مدرسہ بند کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ زبانِ خنجر کے خاموش ہو جانے کے بعد آستین کا لہو

پکارنے لگتا ہے اور خونِ شہید کی سُرخ آج بھی ان انسانی تعلیمات کو دہرا رہی ہے جن کا راستہ بند کرنے کے لیے یزید نے تیس ہزار سے زائد فوجوں کی دیواریں کھڑی کی تھیں۔

حسین اگر فقط مظلوم ہوتے تو دنیا کے انسانیت ان کے غم میں بہر روی کے چند آنسو بہا کر خاموش ہو جاتی، یا دورِ حاضر کی رسم کی بنا پر چند لمحوں کی خاموشی میں غمِ حسین کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔ لیکن حسین کی دُور میں نگاہوں نے مظلومیت کے ہر خاکہ میں تعلیمات کا ایک رنگ بھر دیا ہے۔ مدینہ چھوڑنے سے لیکر سجدہٴ آخر تک حسین کی مظلومیت کے ہر خاکہ میں اسلامی تعلیمات اور انسانی زندگی کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ اس لیے غمِ حسین صرف چند آنسوؤں تک محدود نہیں رہ سکتا، بلکہ آنسوؤں کی چھٹاؤں میں ان اسباق کو بھی دُہرا نا پڑے گا جن کے لیے فرزندِ رسولؐ نے جان قربان کی تھی اور مظلومیت کے خاکہ میں اس رنگ کو بھی دیکھنا پڑے گا جو حسین مظلوم نے اپنے خون کی سُرخ سے بھرا تھا۔

تفصیلی تبصرہ آئندہ تاریخوں میں کیا جائے گا۔ اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ حسین کسی وقتی اور اچانک ظلم کا شکار نہیں ہوئے تھے حسین اتفاقیہ طور پر مصائب کا نشانہ نہیں بنے تھے حسین کی مظلومیت کسی انجان مصیبت کا نتیجہ نہیں تھی۔ بلکہ اس اقدام کے لیے ظلم والے بہت دور سے منصوبہ بنا رہے تھے اور مظلومیت کا علمی دارِ مہر منصوبہ کو ناکام بنانے کے لیے اس سے زیادہ دور سے انتظام کر رہا تھا۔ یزید کی نگاہیں اتنی دور رس

نہیں ہو سکتی تھیں جتنی دور رس نگاہیں فرزند رسول الثقلین کی تھیں۔ یزید یہی سمجھ رہا تھا کہ اچانک بیعت کا مطالبہ اور اس کے ساتھ قتل کی دھمکی حسین کے ہوش اڑا دے گی اور وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی صحیح فیصلہ نہ کر سکیں گے لیکن حسین اپنی امامت کی نگاہ سے اس پورے مستقبل کا جائزہ لے رہے تھے جہاں تک یزیدی نگاہوں کی رسائی نہیں تھی۔ امام حسین نے فیصلہ کیا کہ مجھے ظلم کا مقابلہ مظلومیت سے کرنا ہے لیکن اس اہتمام کے ساتھ کہ مظلومیت کو بیچارگی اور بے بسی کا نام نہ ملنے پائے۔ مجھے مظلومیت میں اسلامی تعلیمات اور انسانی زندگی کا وہ رنگ بھر دینا ہے جو میرے مقصد میرے مقصد کو اور مقصد کے ساتھ میری یاد کو صبح قیامت تک زندہ رکھ سکے۔ آج حسین بھی زندہ ہیں اور حسین کا مقصد بھی زندہ ہے۔ یزید مٹ گیا اور اس کا مقصد بھی فنا ہو گیا۔

— اہل نظر اس حیرت میں پڑے ہوئے ہیں کہ حسین نے اپنے مقصد کو زندہ رکھا یا مقصد کی بلندی نے حسین کو زندہ رکھا۔

یزید نے اپنے مقصد کو مٹایا یا مقصد کی گندگی نے یزید کو فنا کر دیا۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ مقصد کو شخصیت کی فنا و لبقا سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور اس روشنی میں یہ کہنا آسان ہے کہ فرد میں خلوص اور مقصد میں بلندی ہوتی ہے تو فرد مقصد کی حفاظت کرتا ہے اور مقصد فرد کی نگہداشت میں مصروف رہتا ہے۔

حسین آج ساری دنیا کے انسانیت کے جانے پہچانے رہتا ہیں اس کا راز یہی ہے کہ دنیا کے ایک طبقہ نے حسین کو ان کے مقصد سے پہچانا،

تو دوسرے طبقے زحیٰن کے مقصد کو ان کی شخصیت و مطلوبیت سے اور یہ حسینی انداز نظر کا امتیاز ہے کہ دنیا ذات کو بات اور شخصیت کو مقصد سے جدا نہیں کر سکی اور نہ کر سکتی ہے۔

شخصیت اور مقصد کا یہی اتحاد تھا جس کی طرف قرآن حکیم نے ان لفظوں میں اشارہ کیا تھا ”وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ • مُحَمَّدٌ صَفْرٌ اللہ کے رسول ہیں۔ اُن کی شخصیت کا کوئی رُخ اور اُن کی ذات کا کوئی پہلو رسالت سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ زندہ ہی تو رسول ہیں و انتقال کر جائیں یا شہید ہو جائیں تو بھی رسول ہی رہیں گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج مرسل اعظم کو دنیا چھوڑے ہوئے چودہ سو برس کے قریب ہو گئے ہیں لیکن ہر کلمہ استہ اذان سے ایک ہی آواز آرہی ہے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ — ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمدؐ آج بھی اللہ کے رسول ہیں۔

مقصد شخصیت کا جز نہیں بنتا تو کبھی مقصد شخصیت سے پہلے فنا ہو جاتا ہے اور کبھی شخصیت مقصد سے پہلے۔ لیکن جب دونوں ایک دوسرے کے جز بن جاتے ہیں تو اتنا اتحاد ہو جاتا ہے کہ کلمہ کا جز لفظ محمدؐ بھی رہتا ہے اور لفظ رسول اللہؐ بھی۔ اب نہ محمدؐ کا انکار ممکن ہے اور نہ رسالت کا۔ محمدؐ رسالت کے ذمہ دار کا نام ہے اور رسالت محمدؐ کے طریقہ کار کا۔ صلوات

سرسش طاقتیں ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتی ہیں کہ شخصیت کو

مقصد سے الگ کر دیا جائے تاکہ مقصد کو اپنے سانچے میں ڈھالا جاسکے۔ لیکن خالق کائنات نے قرآن حکیم کو قلبِ پیغمبر پر اتار کر کفر کو مایوس کر دیا، اور رسولِ عظیم نے وقتِ آخر قرآن و اہلبیت کے اتحاد کا اعلان کر کے نفاق کو مایوس کر دیا۔ اب زندگی کے کسی موڑ پر بھی مقصد کو شخصیت سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ کردارِ آلِ محمد لینا ہے تو قرآن کے دامن سے حاصل کرو اور قرآن لینا ہے تو آلِ محمد کی ڈیوڑھی پہناؤ۔

شخصیت اور مقصد کے اتصال و انفصال کی متقابل کوشش کا نام ہے کربلا۔ یزید کا مقصد تھا کہ نبیِ ہاشم کو بدنام کر کے اسلام کو ان کے گھرانے سے نکال لے اور پھر اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال دے اور فرزندِ رسول کی آواز تھی کہ اگر دینِ خدا میں استحکام میرے قتل کا محتاج ہے تو جان دے سکتا ہوں، لیکن اسلام کو کردارِ پیغمبر سے الگ کر کے کردارِ یزید کا نام نہیں دے سکتا۔ یہ حسینی سیاست کا معجزہ تھا کہ حسین نے یزید کو ایک ایسے موڑ پر لاکر کھڑا کر دیا جہاں یزید، امام حسین سے اپنی بیعت کے بغیر اپنے منہ کو نامکمل سمجھتا ہے اور اپنی حکومت کو اسلامی رنگ دینے کے لیے ساری کائنات میں صرف حسین سے بیعت کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ حسین کی ذاتِ اسلام سے اس قدر متحد ہے کہ حسین کی تصدیق کے بغیر کوئی حکومت اسلامی نہیں کہی جاسکتی۔ کاش یہی بات دنیا کے دوسرے مسلمان بھی محسوس کر لیتے اور انھیں اندازہ ہو جاتا کہ جس حکومت کو حسین کے گھروالوں نے ٹھوکر ماردی ہے وہ حکومتِ اسلامی نہیں ہو سکتی۔ اسلام، حسین

کے گھر کا پروردہ ہے اور حسین کا گھرانہ اسلام کا حقیقی ترجمان و نگران ہے۔  
 ع ” اسلام ہی کا اسمِ گرامی حسین ہے “

۲۸ رجب کی رات تھی جب نزیدیت نے اپنی مہم کا پہلا قدم اٹھایا اور نزید کے گورنر نے امام حسین کو راتوں رات دربار میں طلب کر لیا۔ ابن زبیر جیسے کمزور نفس افراد نے راہِ فرار اختیار کی لیکن حسینؑ علیؑ کے لال حسینؑ — فاتحِ خیبر کے فرزند حسینؑ — فاتحِ دربارِ ظلم کے نورِ نظر حسینؑ نے یہ طے کر لیا کہ مجھے دربار میں جانا ہے اور ولید سے باقاعدہ فیصلہ کن گفتگو کرنا ہے۔ یہ عزم کے بہت الشرف میں تشریف لائے بہن کو پیغام سنایا۔ بہن نے ارادہ دریافت کیا۔ امام حسینؑ نے فرمایا۔ ” بہن میں دربارِ ولید میں جا رہا ہوں، دیکھو اس کا مقصد کیا ہے۔

بہن کا دل تڑپ گیا۔ عرض کی۔ ماں جاؤے! میں آپ کو اکیلے نہ جانے دوں گی۔ اگر جانا ہی ہے تو اپنے ساتھ میرے شیر عیاش کو لے جائیے، میرے لال اکبر کو لے جائیے، ہاشمی جوانوں کو لے جائیے تاکہ زینب کے دل کو اطمینان رہے کہ میرا بھتیجا اکیلا نہیں ہے۔ اس کی پشت پر میرے شیروں کی ایک فوج ہے۔ جاں نثاروں اور غلاموں کا ایک لشکر ہے۔

یہ کہہ کر ہاشمی جوانوں کو طلب کیا، اور سب کو تیار کر کے بھائی کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اور فرمایا، میرے ہاشمی جوانو! میرے دل کے ٹکڑو! یہ خیال رکھنا کہ میرا مانجا یا پہنچے پہل مجھ سے جدا ہو کر جا رہا ہے۔ دیکھو! میرے بھتیجا پر کوئی آنجناب نہ آنے پائے۔

میں نہیں جانتا کہ زینبؓ نے بنی ہاشم کے جوانوں سے کیا کہا۔۔۔  
تاریخ کے اوراق بھی خاموش ہیں لیکن میرادل کہتا ہے کہ زینبؓ کے جذبات ان  
تمام ہدایات کی طرف متوجہ کر رہے ہوں گے جو ایک بہن اپنے بھائی کی حفاظت  
کے لیے کر سکتی ہے۔

امام حسینؑ دربار کی طرف چلے۔ زینبؓ کا لشکر ساتھ ساتھ چلا۔ دربار تک  
پہنچے۔ ہاشمی جوانوں کو دروازہ پر روکا۔ خود دربار میں داخل ہوئے۔  
ولید نے احترام سے بٹھایا۔ مرگ معاویہ کی خیر نمانی حسینؑ نے اسلامی  
تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے کلمہ اِنَّا لِلّٰہِ زبَانِ پر جاری کیا۔

بنی امیہ کے نمک خواروں کا بیان ہے کہ امام حسینؑ نے اس موقع پر  
حاکم شام کے لیے دعائے رحم و کرم بھی کی، لیکن یہ بات انتہائی نامعقول  
اور ناممکن ہے۔ کلمہ اِنَّا لِلّٰہِ اسلامی تعلیم اور ہاشمی اخلاق ہے۔ لیکن ظالم  
بادشاہ کے لیے دعائے رحم و کرم کرنا کسی اسلام کی تعلیم نہیں ہے۔ بھلا حسینؑ  
اس کے لیے کیا دعائے رحم و کرم کریں گے جس کی سازش نے انھیں تہمت بتایا  
ہے۔ جس کے زہر نے ان کے بھائی کے جگر کے بہتر ٹکڑے کیے ہیں اور جس  
کے بنائے ہوئے حاکم نے آج بیعت کا مطالبہ کیا ہے۔ (الْعِيَاذُ بِاللّٰہِ)  
خبر وفات کے ساتھ ولید نے یزید کا پیغام سُنا یا۔ حسینؑ آپ کو  
بیعت کرنا ہوگی۔

آپؑ نے فرمایا، یہ اہم مسائل پر وہ شب کی تاریکی میں نہیں طے ہوتے  
کل دربار میں مجھے بلانا میں اُس وقت گفتگو کر کے یہ واضح کروں گا کہ بیعت

کا حقیقی حقدار کون ہے اور بیعت کسے کرنا چاہیے۔

امام حسین علیہ السلام کی منطقی گفتگو نے ولید کو مطمئن کر دیا اور اس نے

آپ کو رخصت کر دیا، لیکن مروان بول پڑا۔

ولید! اگر آج حسین بچ کر نکل گئے تو پھر ہاتھ نہیں آئیں گے۔ بہتر ہے

کہ ان سے بیعت لے لے، یا ان کا قتل کر لے۔

یہ سننا تھا کہ فاتح خیبر کے لال کو جلال آگیا، اور فرمایا: اوزن نیلگوں حشیم

کے بچے۔! تو مجھے قتل سے ڈرا رہا ہے؟ کس کی مجال ہے جو میری طرف نظر

اٹھا کر دیکھے۔

امام کی آواز کا بلب بلبنا تھا کہ ہاشمی جوان دربار میں داخل ہو گئے۔ آگے

آگے تلوار لیے ہوئے قمر بنی ہاشم۔ چہرہ غصہ سے سُرخ، نیوریاں چڑھی ہوئی

حیدر گزار، کا جلال نمایاں۔ خبردار! ولید، اب مولا کی شان میں کوئی

گستاخی نہ ہونے پائے۔

ولید بدحواس ہو گیا۔ فرزندِ رسولؐ نے بھائی کو روک دیا۔

بس بھیا عباسؓ بس! میرے بھائی یہ وقت جہاد نہیں ہے۔

مولا کا حکم ملا، عباسؓ نے تلوار نیام میں رکھی اور ہاشمی جوانوں کے حلقے

میں مولا کو لے کر بیت الشرف تک آئے۔

جیسے ہی ثانی زہرانے بھائی کو دیکھا، دوڑ کر مانجائے سے لپٹ گئیں

ارے میرے بھیا آپ واپس آگئے۔؟

زینبؓ کو سخت اضطراب تھا، دیکھیں، کیا گذرتی ہے۔ اماں کی یادگار!

آپ واپس آگئے؟

توزینب کا دل ٹھہر گیا۔ کیوں نہ ہو۔ میرا عباس ساتھ تھا، میرے ہاتھی جوان ہمراہ تھے۔

عزادارانِ حسین! جی چاہتا ہے عرض کروں شہزادی! آج جب بھائی دربار کیلئے گئے تو آپ نے ایک پورا ہاتھی لشکر ساتھ کر دیا۔ لیکن کل جب عصرِ عاشور آپ کا مانجیا مقتل میں جائے گا تو کیا کیجئے گا؟ کون ساتھ جائے گا۔ کون رکاب تھا مے گا۔ کون گھوڑے پر سوار کرے گا؟ اُس وقت نہ قائم ہونگے، نہ عون و حمزہ، نہ علی اکبر ہوں گے، نہ عباس۔

عجب نہیں شہزادی جواب دیں۔ جب کوئی نہ ہوگا تو زینب اپنے بھتیجا کو رخصت کرے گی۔ زینب خبر گیری کیلئے میدان میں جائے گی، زینب آواز دے گی اور سپرِ سعدؓ میرا مانجیا ذبح ہو رہا ہے اور تو گھڑا دیکھ رہا ہے۔

عزیزو! جو زینب نے دل میں طے کیا تھا وہی کیا جب حسین کیلئے رخصت ہونے لگے تو دُخیمہ پر آکر بازو تھام کر گھوڑے پر سوار کیا اور جب گھوڑے سے گرے تو گھبرا کر میدان میں آگئیں اور وہ منظر دیکھا جو خدا کسی بہن کو نہ دکھائے۔ ہائے وہ حسین کا سجدہ آخر وہ شمر کا خنجر اور وہ زینب کی فریاد۔

حسین نے اشارہ کیا۔ زینب خیمہ کی طرف لوٹیں، زمین کربلا ہی، فضا میں آواز گونجی اَلَا قَتَلَ الْحَسِينَ بِكْسِ بِلَا، اَلَا ذَمَّحَ الْحَسِينَ بِكْسِ بِلَا  
اَنَا لِلّٰهِ وَاَنَا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ •

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ  
أَشْرَفِ الْأَوْلِيَاءِ وَالْآخِرِينَ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا إِلَى الْعَالَمِ  
مُحَمَّدٍ وَإِلَيْهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ وَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى  
أَعْدَائِهِمْ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ أَمَا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى  
فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ • (وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ -)

قرآن حکیم نے حضور سرور کائنات کا تعارف ان مختصر الفاظ میں کر لیا  
ہے کہ ”وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ“، محمد کچھ نہیں ہیں یہ صرف  
اللہ کے رسول ہیں۔ ان کی رسالت بھی کوئی نئی چیز نہیں ہے، جسے تم نہ سمجھ  
سکتے ہو۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں تمہیں رسالت کے  
معنی بھی معلوم ہیں، تم رسول کی حیثیت اور عظمت سے بھی باخبر ہو۔ اور  
تمہیں ان قوموں کے حالات بھی معلوم ہیں جنہوں نے اپنے دور کے رسولوں  
کا انکار کیا اور دنیا و آخرت کا خسارہ اٹھایا۔

انسان جب دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اپنے ہمراہ ميثمار مادی اور

دنیادی تعلقات لیکر آتا ہے۔ یہ تعلقات کبھی رشتوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں اور کبھی دوسرے عنوان سے دکھائی دیتے ہیں۔

آنے والا بچہ ایک ماں باپ کا بیٹا ہوتا ہے تو ایک بہن یا بھائی کا بھائی  
ایک دادا کا پوتا ہے تو ایک نانا کا نواسہ ایک چچا کا بھتیجا ہوتا ہے تو ایک  
ماموں کا بھانجا۔

خون کے ان رشتوں کے علاوہ کچھ اور تعلقات بھی ہوتے ہیں کہ وہ  
ایک ملک کا باشندہ ہوتا ہے تو ایک زبان کا خوگر۔ ایک قوم کی فرد  
ہوتا ہے تو ایک قبیلہ کا رکن۔ ایک وطن کا رہنے والا ہوتا ہے تو ایک جماعت  
کا ممبر۔ اس کے بعد جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے زندگی کی ضروریات  
میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ حیات مختلف ترقی کی منزلوں سے گزرنے لگتی  
ہے۔ اور ہر منزل کے ساتھ ایک نئے رشتے کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ کبھی  
وہ استاد کا شاگرد بنتا ہے کبھی شاگرد کا استاد۔ کبھی دفتر کا ملازم بنتا ہے  
کبھی ملازموں کا حاکم کبھی زوجہ کا شوہر ہوتا ہے کبھی بچوں کا باپ۔ غرض زندگی  
کے ہر موڑ پر ایک نئے رشتے کا اضافہ ہوتا ہے اور حیات چند روزہ کا ہر  
لمحہ ایک نئی ذمہ داری لے کر آتا ہے۔

زندگی کے ان ہی اعتبارات کے ساتھ اس کے نام اور عنوان بھی  
بدلتے جاتے ہیں۔ وہ ایک نام قوم کے اعتبار سے پاتا ہے تو ایک ملک کے  
اعتبار سے۔ ایک عنوان وطن سے حاصل کرتا ہے تو ایک قبیلہ سے۔ لیکن.....  
مادیت کے یہ رشتے اس وقت مضحکہ اور کمزور ہونے لگتے ہیں جب انسان

روحانی ترقیوں کی منزلوں میں قدم رکھتا ہے۔ وہ قوم اور قبیلہ کا فرد اسے وقت تک شمار ہوتا ہے جب تک اس کی عوامی حیثیت نہیں ہوتی عوامی حیثیت حاصل کر لینے کے بعد وہ سارے عنوان خود بخود بدل جاتے ہیں۔ انسان ابتدائی زندگی میں ایک گھرانہ اور خاندان کی ملکیت ہوتا ہے اور درجہ کمال پر فائز ہونے کے بعد پوری قوم کی ملکیت بن جاتا ہے گھر میں چلنے والی روشنی گھر والوں کی ملکیت ہے لیکن آفتاب عالم تاب پوری دنیا کے لیے ہے جوص میں جمع ہونے والا پانی ایک گھر کی ملکیت ہے لیکن ہمد پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اصولِ فطرت نے ہی انسان کو یہ سکھا دیا ہے کہ محدود شخصیت محدود افراد کے لیے ہوا کرتی ہے اور شخصیت کا پھیلاؤ اس کی ہمہ گیری کا سبب بن جاتا ہے۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ بڑی حیثیت پیدا کرنے کے بعد انسان کسے ابتدائی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ تو غمیں کن ہے۔ انسان قوم و قبیلہ و وطن زبان کے شکنجوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ شکنجے اس کسے پھیلی ہوئی شخصیت کو اپنے گھیرے میں لینے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ آپ نے برابر تجربہ کیا ہوگا کہ پانی ابتدائی منزلوں میں روکنے کے لائق ہوتا ہے لیکن سیلاب بن جانے کے بعد کسی گھیراؤ (رُکاوٹ) کو قبول نہیں کرتا۔ یہی حیثیت عالمی شخصیتوں کی ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنے کمالات کی بنا پر ان منزلوں پر پہنچ جاتے ہیں، جہاں چھوٹے چھوٹے بندھوں کا گزر نہیں ہوتا، اور شخصیت کسے

بہم گیری ان بندھوں کو تحت الشعاع میں ڈال دیتی ہے۔

ایک سیاہی رنگی وطن و خاندان کی ملکیت نہیں ہے۔ وہ ایک پوری قوم کی متاعِ بے بہا ہے۔ ایک ڈاکٹر کسی قبیلہ و نسل کی جاگت نہیں ہے بلکہ پوری قوم کا سرمایہ ہے۔ ایک عالم دین کسی رنگ و نسب کا پابند نہیں ہے بلکہ پوری دنیائے مذہب کا سرمایہ افتخار ہے۔

شخصیت کا پھیلاؤ اس کے ابتدائی رشتوں کو کمزور اور اس کے مادی تعلقات کو ناقابلِ توجہ بنا دیا کرتا ہے۔ سرکار سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی شخصیت کی ہم گیری اور آفاقیت کا راز بھی یہی ہے کہ حسین کمالات کی ان منزلوں پر ہیں جہاں قوم و ملت رنگ و نسل، قبیلہ و خاندان کے شکنجوں کی رسائی نہیں ہے۔ حسین کی عظمت تک خود دنیائے انسانیت کی بھی رسائی نہیں ہے۔

یہ سوچنا غلط ہے کہ حسین کو ساری دنیائے انسانیت کا شہید بنا دیا جائے تو ان کی عظمت کو چار چاند لگ جائیں گے اور وہ ملک و ملت، قبیلہ و قوم کے شکنجوں سے آزاد ہو کر بین الاقوامی شخصیت بن جائیں گے۔ ان کی شان یہ ہوگی کہ صرف ایک قوم نہیں بلکہ ”ہر قوم پکارے گی ہمارے حسین“۔ یہ تصور عظمت حسین کے تہ پہچانتے ہی سے پیدا ہوا ہے۔ حسین کی ذات جس طرح قوم و ملت میں اسیر نہیں کی جاسکتی اسی طرح ان کی عظمت کو دار کو انسانیت کے محدود تصورات کا پابند نہیں بنایا جاسکتا۔ حسین اس بلندی پر ہیں جہاں انسانیت تو انسانیت کل کائنات کی رسائی نہیں ہے۔

دنیا نے حسینؑ کے رشتے کو انسانیت سے جوڑا ہے اور خود حسینؑ نے اپنے رشتے کو خدا سے جوڑا ہے۔ انسانیت ایک محدود تصور ہے اور خدا ایک لامحدود ہستی۔ محدود سے رشتہ، شخصیت کو محدود بنا دیتا ہے، اور لامحدود سے لعلق عظمت و بلندی کی حد بندیوں کو توڑ کر شخصیت کو ابدی اور سرمدی بنا دیا کرتا ہے۔

دنیا نے امام حسینؑ علیہ السلام کی اس عظمت کو پہچان لیا ہے تو قرآن مجید کے اس فقرے کا سمجھنا بہت آسان ہے جسے میں نے عنوانِ کلام قرار دیا ہے اور مرسلِ اعظمؑ کی اس حیثیت کا اندازہ آسان ہے جسے میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

حسینؑ اپنے نانا کی عظمت کا آئینہ ہیں۔ حسینؑ کردارِ پیغمبرؐ کی تصویر ہیں۔ حسینؑ بلندیِ رسالت کے سمجھنے کا پیمانہ ہیں جس نے حسینؑ کو نہیں پہچانا وہ پیغمبرؐ کو بھی نہیں پہچان سکا۔

قرآن حکیم نے مرسلِ اعظمؑ کی اسی عظمت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میرا حبیبؐ اپنے وجودِ ظاہری کے ساتھ بشمارِ رشتے لیکر آیا ہے اس کے ساتھ قوم کا رشتہ بھی ہے اور خاندان کا بھی۔ یہ زبان کا رشتہ بھی رکھتا ہے اور وطن کا بھی۔ اسے مکی کہنا بھی درست ہے اور مدنی بھی۔ یہ عربی بھی ہے اور ہاشمی بھی۔ لیکن اپنے کمالات کی بنا پر عظمت و جلالت کی اس منزل پر ہے جہاں ان معمولی رشتوں کی رسائی نہیں ہے۔ اسے رشتوں میں محدود کرنا اس کی عظمت کی توہین ہے۔ اسے پہچانتا ہو تو لوگوں پہچانو...

”وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ“ (محمد صرف اللہ کا رسول ہے) اس کا رشتہ خدا سے اتنا گہرا اور مستحکم ہے کہ باقی رشتے ماند پڑ گئے ہیں اور ان کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی ہے۔ اس کی معرفت یہ نہیں ہے، کہ اسے مکہ، مدینہ، عرب اور ہاشمیت سے پہچان لو اس کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ اسے خدا کے ذریعہ اور خدا کو اس کے ذریعہ پہچان لو۔ اسی لیے قرآن حکیم نے وضاحت کر دی تھی کہ ”میرے حبیب! آپ یوں کہتے کہ میری نماز میری عبادتیں میری زندگی اور میری موت سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔“

میں قوم و ملت کی خدمت بھی خدا ہی کے لیے کرتا ہوں اور قبیلہ و خاندان سے انس و الفت بھی اسی کے لیے رکھتا ہوں۔ وہ کسی کو اپنا بنا لیتا ہے۔ میں اہلیت میں شامل کر لیتا ہوں۔ وہ کسی پر غضبناک ہو جاتا ہے تو میں بھری محفل سے اٹھادیتا ہوں۔

تا واقعہ ہیں وہ افراد جو مجھے مکہ و مدینہ سے پہچانتا چاہتے ہیں اور نااہل ہیں وہ انسان جو زلف و رخسار کو میری عظمت کا پیمانہ سمجھتے ہیں میری عظمت کا صرف ایک پیمانہ ہے اور اس کا نام ہے رسالت۔ میں قوم و ملت کا ہو جاتا تو دنیا کے شکنجوں میں گرفتار ہو کر رہ جاتا۔ میں نے اپنے کو وطن و خاندان کے لیے وقف کر دیا ہوتا تو اس کے ساتھ فنا ہو جاتا۔

میں نے اپنی زندگی کو مالک کی بندگی کے لیے وقف کر دیا ہے میری ہستی صرف رب العالمین کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے

دنیا کا کوئی شکنجہ گرفتار نہیں کر سکتا۔ محدودیت کی کوئی زنجیر میری شخصیت کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی اور انسانیت کی کوئی کند میری بلندی تک نہیں پہنچ سکتی۔

میرا منزل معراج کی رات معلوم ہوئی ہے جب ساری کائنات میرے زیرِ قدم تھی اور عرشِ اعظم میری جوتیوں کے نیچے اگیا تھا۔ اُس دن دنیا کو معلوم ہوا کہ دنیا والوں کی رسائی کہاں تک ہے اور اللہ والوں کی عظمت کی انتہا کہاں تک ہے۔

یہ معراج کی رات کوئی مکی، مدنی نہیں جا رہا تھا۔ یہ عرش کی بلندیاں کسی عربی یا ہاشمی کے زیرِ قدم نہیں تھیں۔ یہ سماوات عبد اللہ کے فرزند اور عبد المطلب کے پوتے کے قدم نہیں چوم رہے تھے۔ یہ ملائکہ آسمان، قاسم و طاہر کے باپ کا استقبال نہیں کر رہے تھے۔

یہ عبدیت کی معراج تھی جہاں عبد جانے والا تھا اور مجھوں نے جانے والا۔ بندگی سجدہ گہ کی تلاش میں تھی اور الوہیت مسیحاِ قصی کی نشاندہی کر رہی تھی۔

دنیا پہچان سکے تو پہچانے کہ عظمت کا معیار قوم و قبیلہ نہیں ہے عظمت کا معیار تو عبودیت اور بندگی ہے۔ معراج کے تذکروں پر سر دھنے والے سمجھ سکیں تو سمجھیں کہ قابِ قوسین تک محمدیت نہیں گئی تھی، بلکہ عبدیت نے سیر کی تھی۔ اب عظمتِ رسول کا اندازہ کرنا ہے تو محمدیت کے رشتوں کو نظر میں نہیں لانا ہوگا، بلکہ عبدیت اور رسالت کے رشتوں پر غور

کرنا ہوگا۔

ممکن ہے کوئی انسان یہ سوچے کہ معراج میں تو عبدیت کا ذکر ہے رسالت سے کیا واسطہ، رسالت اور ہے اور عبدیت اور۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ رسالت کی عظمت کیا ہے عبدیت سے اس کا کیا تعلق ہے لیکن میں پہلے تو یہ عرض کروں گا کہ رسالت عبدیت ہی کے عظیم درجہ کا نام ہے عبدیت جتنی بڑھتی جائے گی رسالت کے مراتب میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ کیا آپ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لفظیں نہیں سنی:

” اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اَتَّسِّنِیْ الْکِتٰبَ وَجَعَلْتَنِیْ نَبِیًّا“  
(سورہ مریم آیت ۳۰)

(میں اللہ کا بندہ ہوں اُس نے مجھے کتاب دکھا ہے اور نبی بنایا ہے) یعنی عیسیٰ نے عبدیت ہی کو نبوت کی تمہید بنایا ہے عیسیٰ کی عبدیت انہیں نبوت تک لے گئی اور مرسلِ اعظم کی عبدیت نے اُن کے فرقِ اقدس پر ختم نبوت کا تاج رکھ دیا۔

اس کے علاوہ ایک نکتہ یہ بھی ہے..... کہ معراج میں عبدیت اور رسالت دونوں کا تذکرہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عبدیت جانے میں کام آئی ہے اور رسالت آنے میں کام آئی ہے۔

عبدیت نے اپنی روحانی اور معنوی ترقی کی بنا پر قیام تو سین تک پہنچایا اور رسالت نے وہاں بھی ذمہ داریوں کا حامل بنایا عبدیت کے تذکرے کے بعد معراج کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مالکِ کائنات

نے اعلان کیا۔

وَلِذُرِّيَّتِهِ مِنْ آيَاتِنَا ط (بنی اسرائیل آیت ۱)

(اس معراج کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے بندے کو اپنی نشانیاں

دکھلانا چاہتے ہیں۔)

خدا ہی جانے کہ اُس نے کیا نشانیاں دکھلائیں اور صاحب

معراج ہی جانے کہ اُس نے کیا دیکھا۔ ہاں قرآن میں ایک فقرہ محفوظ رہ گیا

وَوَاحٍ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ط (الدخان آیت ۱۰)

(اُس نے جو کچھ چاہا اپنے بندے کو (وحی کے ذریعہ) اشاروں ہی

اشاروں میں سمجھا دیا۔)

تاریخ اس صیغہ راز کی تلاش میں تھی۔ ایک مرتبہ غدیر خم کے میدان

نے آواز دی۔ ”اے میرے رسول! اسے پہنچا دو جو تمہاری طرف

نازل کیا جا چکا ہے۔“

نبی نے قافلے کو روک کر علیؑ کی ولایت کا اعلان کیا اور شب معراج

نے آواز دی۔ ”لو معراج کا پردہ اٹھ گیا اور کل جو بات صیغہ راز میں تھی آج

عالم میں آشکار ہو گئی۔“

اعلانِ غدیر میں ”يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ“ کا لفظ گواہ ہے کہ معراج

کی رات عبدیت، رسالت کا مخصوص پیغام لینے کے لیے قاب قوسین

کی منزلوں تک گئی تھی عبدیت اپنا کام کر رہی تھی اور رسالت اپنے فرائض

کا انتظار کر رہی تھی۔

عبدیت کا یہی وہ ارتقاء ہے اور ”دَنَا فَدَلَّتِي“ کا یہی وہ مزاج ہے جس نے فرزندِ رسولؐ کو معراج شہادت تک پہنچنے کے لیے آمادہ کیا۔ اور حسینؑ نے ایک سجدہٴ آخری کے لیے یہ اہتمام کیا کہ نانا کا وطن چھوڑ دیا۔ اللہ کے حرم سے جدائی برداشت کر لی اور کربلا کے میدان تک آگئے۔

نبیؐ کا سفر معراج راتوں رات ہوا تھا اور حسینؑ نے اپنا سفر ون دہاڑے شروع کیا۔ رات کی تاریکی میں نانا کے روضے سے رخصت ہوئے، ماں کی لحد کو الوداع کہا۔ بھائی کی قبر کو آخری سلام کیا اور صبح ہوتے ہوئے سارے خاندان کو آمادہٴ سفر کر لیا۔ جو باقی رہ گئے انہیں رخصت کرنے کا اہتمام کیا۔ سب سے پہلے اپنی نانی اُم سلمہ کی خدمت میں آئے۔ نانی اماں! اپنے حسینؑ کا سلام لیجیے۔

جناب اُم سلمہ نے ٹرپ کر لوچھا، میرے لال ارادہ کیلہ ہے؟  
کہا، نانی، عراق جا رہا ہوں۔

عراق کا نام سُننا تھا کہ اُم سلمہ کا دل دہل گیا۔ بیٹا! عراق۔۔۔ عراق۔۔۔ میرے حسینؑ! یہ عراق کا نام کیوں لیا۔ عراق کا ارادہ کیوں کر لیا؟ عراق والوں نے تمہارے باپ اور بھائی کے ساتھ وفا نہیں کی۔ اب تم کیوں عراق جا رہے ہو؟ حسینؑ! پہلے اپنے نانا سے تو رخصت لے لو۔

آواز آئی نانی اماں! یہ حکم میرے نانا ہی نے دیا ہے۔ نانا نے

فرمایا ہے حسین! کربلا جاؤ۔ میرے لال! سرکٹاؤ، اور میرے دین کو بچاؤ۔ اُم سلمہ کلیمہ پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

ارے میرے لال! کوئی یوں بھی اپنے مرنے کی خبر سناتا ہے۔ بیٹا! تو مجھے کیوں رُلا رہا ہے، میرے لال۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری خبر کیسے ملے گی، تمہارے سفر کے حالات کیسے معلوم ہوں گے؟

امام حسین نے کہا، 'نانی اماں، میں آپ کو ایک جگہ دکھلانا چاہتا ہوں نانی اماں نے رخصت شتیاق آنکھیں کھولیں۔ نواسے نے اشارہ کیا۔ عالم کی زمینیں پست ہوئیں کربلا کی زمین بلند ہوئی۔

حسین نے اشارہ کیا۔ نانی جان! آپ اس نشیب کو دیکھ رہی

ہیں۔؟

اُم سلمہ نے غور سے دیکھا، حسین نے کہا، نانی اماں! یہی وہ جگہ ہے جہاں آپ کے حسین کا گلا کاٹا جائے گا۔ یہیں آپ کا لال شہید ہوگا۔ یہیں بچپن کی آخری تصویر خاک میں ملائی جائے گی۔ یہیں فاطمہ کا باغ اُجڑے گا اور نبی کا گلستان خزاں کی نذر ہو جائے گا۔

اُم سلمہ نے آنسوؤں کو روک کر غور سے اپنے لال کے مقتل کو دیکھا۔ دل نے تڑپ کر آواز دی۔ اُم سلمہ! دیکھ لو، اب حسین پھر نہ ملیں گے۔ اب یہ تصویر پھر نہ دیکھنے میں آئے گی۔ اب یہ حسین پھر پلٹ کر نہ آئے گا۔

نانی نے جی بھر کر نواسے کو دیکھا۔ دل کو سنبھال کر لوچھا، بیٹا! یہ تو بتاؤ

یہ واقعہ کب پیش آئے گا اور مجھے اس واقعے کی خبر کیوں کہ ہوگی ؟  
 امام حسین نے ہاتھ بڑھا کر ایک مٹھی خاک کر بلا اٹھائی اور جناب  
 اُم سلمہ کے حوالے کر دی۔ نانی اماں ! آپ اس خاک پر نظر رکھیں جب  
 تک یہ خاک خاک رہے، سمجھیں کہ آپ کا حسین زندہ ہے اور جب یہ خاک  
 خون میں تبدیل ہو جائے، سمجھیں آپ کا حسین مار گیا۔  
 حسین مرینہ چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ مکہ آئے، اور مکہ سے رخصت  
 ہو کر بلا ہوئے۔

ادھر جناب اُم سلمہ کا دستور یہ ہے کہ جب دل گھبراتا ہے اور حسین  
 کی یاد تڑپاتی ہے تو گھبرا کر اس شیشے کو دیکھ لیتی ہیں۔ خاک کو بشکل خاک پا کر  
 دل ہی دل میں دُعا دیتی ہیں۔ ”اللہ ! میرے حسین کو سلامت رکھے۔  
 اللہ ! میرے لال کو دشمنوں سے بچائے۔ میرے مالک ! تیرا شکر ہے  
 ابھی فاطمہ کا لال زندہ ہے۔ ابھی میرا حسین بخیریت ہے۔

وقت گزرتا رہا، حالات بدلتے رہے۔ محرم کا چاند فلک پر  
 نمودار ہوا، اب اُم سلمہ کا دل برابر دھڑکنے لگا۔ ادھر حسین کے بچوں پر  
 پانی بند ہوا، ادھر اُم سلمہ کا دل تڑپا۔ ادھر حسین زعفرانہ اعداد میں گھرے ادھر  
 اُم سلمہ کے اضطراب میں اضافہ ہوا۔ ادھر حسین عاشور سے قریب تر ہوتے  
 رہے، ادھر اُم سلمہ کی الجھنیں بڑھتی رہیں اور جب الجھنیں پیدا ہوں، دوڑ کر  
 جائیں اور شیشی کو دیکھ لیں۔ دل ٹھہر جائے۔  
 یہاں تک کہ عاشور محرم کا دن آیا۔ آج اُم سلمہ کو صبح سے قرار نہیں۔

بار بار شیشی کو دکھیتی ہیں اور حسین کی سلامتی کی دعائیں کرتی ہیں۔ ایک مرتبہ ظہر کے بعد ام سلمہ بستر پر لیٹ گئیں، شدتِ اضطراب میں آنکھ لگ گئی۔ دیکھا رسول اکرم ﷺ سامنے کھڑے ہیں، عالم یہ ہے کہ سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں استینیں اُلٹی ہوئی ہیں، بالوں پر خاک پڑی ہوئی ہے۔

گھبرا کر پوچھا۔ خدا کے رسول! یہ آپ کا کیا عالم ہے؟  
 فرمایا، اُم سلمہ! تم سو رہی ہو۔ میں لٹ گیا، میرا حسین مار ڈالا گیا۔  
 اُم سلمہ! میرا گھرا جڑ گیا۔ اُم سلمہ! کربلا میں سب شہید ہو گئے۔ ذرا غور سے تو دیکھو، یہ میرے سر پر خاک کیسی ہے، یہ میرے بال کیوں بکھرے ہیں، یہ میں نے استینیں کیوں اُلٹی ہیں؟ اُم سلمہ! میں صبح سے کربلا کے میدان میں تھا میں نے اپنے حسین کا گلا کٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے اپنے لال کو زیرِ خنجر تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔ اُم سلمہ! یہ میرے سر پر کربلا کی خاک ہے اور میرے بدن پر حسین کے خون کی چھینٹیں ہیں۔

عزادارو! یہ سنا تھا کہ اُم سلمہ تڑپ گئیں، گھبرا کر آنکھ کھولی تو جناب رسول اکرم ﷺ تو نظر نہ آئے لیکن زبان پر یہ فقرے جاری ہو گئے۔

”و و امحمد ادا واعلیا واحسینا و اثمرۃ فواد ادا“  
 ارے میرے لال! ارے میرے حسین!

میری زہرا کے جائے تو کربلا میں شہید ہو گیا۔ میرے حسین! تجھے دشمنوں نے قتل کر ڈالا۔ کاش کوئی ہوتا تو میرے حسین کو خنجر قاتل سے بچا لیتا۔ کاش کوئی ہوتا جو وقتِ آخر ایک قطرہ آب دے دیتا مگر افسوس کہ کسی

کو میرے حسین پر رحم نہ آیا، کسی نے نہ سوچا کہ میرا حسین رسول اللہ کی گود کا پالا ہے اسے زہرا نے بڑی مشقتوں سے پالا ہے، اس کے لیے جنت سے لباس آیا تھا، آسمان سے نعمتیں آئی تھیں اور آج وہی حسین ایک ایک قطرہ آب کو ترسایا گیا۔ ہلے یہ آسمان گر کیوں نہیں پڑا، یہ زمین تباہ کیوں نہیں ہو گئی، یہ کائنات باقی کیسے رہ گئی جب زہرا کی کائنات اُجر گئی اور پیغمبر کا باغ کٹ گیا۔

میں کہوں گا نبی! آپ تعجب نہ کریں۔ کائنات میں انقلاب آیا ہے زمین ہلے ہے، آسمان سے خون برس رہا ہے، آفتاب کو گہن لگا ہے، سیاہ آندھیاں چلی ہیں، مگر ظالم شمر کو رحم نہ آیا اور اُس نے اپنا نخر چلا دیا۔

اَنَا لِلّٰهِ وَاَنَا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ  
وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا اَيُّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ •

۳

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ •

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَ  
السَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ سَيِّدِنَا وَ  
مَوْلَانَا أَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ  
وَلَعَنَةَ اللَّهِ عَلَى أَعْدَائِهِمْ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ أَمَا بَعْدُ  
فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ  
﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ﴾ يَا

ارشاد جناب رب العزت ہے: ” اور محمد صرن میرے رسول ہیں  
میرے رشتے کے بعد کسی دنیاوی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ میرا ہے  
میرا، میرے علاوہ کسی کا کچھ نہیں ہے۔“

سوچنے کی بات ہے کہ جب رسول اکرم کی زندگی میں ہر انسان کی طرح  
بیشمار پہلو پائے جاتے ہیں اور آپ کی حیاتِ طیبہ بھی مختلف رشتوں میں  
اسیر ہے۔ تو مالکِ کائنات کے اس ارشاد کا مطلب کیسا ہے۔ اس سلسلے میں

مختلف ادقات میں مختلف توجیہات بیان کی جا چکی ہیں۔ آج ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ مرسلِ عظیم کی زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو قابلِ انکار نہیں ہے۔ آپ انسان ہیں تو انسانی زندگی کے تمام تعلقات بھی رکھتے ہوں گے، لیکن دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب کسی مال پر کسی کارخانے کی مہر اور اس کی چھاپ نہیں ہوتی تو خسریدار کو مال کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ اور اس کا مادہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کی ساخت و پرداخت پر نظر کرنا پڑتی ہے۔ لیکن جب معتبر کارخانے کی مہر یا چھاپ مل جاتی ہے تو مادہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور کارخانے کے اعتبار پر سودا کر لیا جاتا ہے۔ اب اگر مال خراب بھی ہوگا تو بیچنے والے سے کوئی باز پرس نہ ہوگی، بلکہ اس کارخانے کے مالک سے بات کی جائے گی جس نے اس مال کو بنایا ہے، اور اس پر اپنی مہر لگا کر گارنٹی کارڈ ایجا کیا ہے۔

اس مہر اور چھاپ کا ایک فائدہ مال کے اعتبار اور عدم اعتبار کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ بھی پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ مال کس کارخانے کا ہے اس کی ساخت و پرداخت کس ملک میں ہوئی ہے اور اس کی ضمانت اور گارنٹی کا اعتبار کتنا ہے۔

کمپنیاں اپنی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے اتنی ہی ضمانت دیتی ہیں جتنا انھیں اپنے مال پر اعتبار ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مال میں بقا کی صلاحیت دو سال کی ہو اور ضمانت دس برس کی دے دی جائے اور نتیجہ میں ساری کمپنی بنام ہو جائے اور اُسے دنیا کی نگاہوں میں بے اعتبار قرار دے دیا جائے۔

ضمانت کا اصول بھی یہ ہے کہ ضمانت زبانی نہیں ہوتی بلکہ ایک تحریر کی شکل میں ہوتی ہے جسے خریدار اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے تاکہ وقت ضرورت کارخانے کے مالک کو دکھا کر اُس سے یہ مطالبہ کر سکے کہ آپ نے دس سال کی ضمانت کا کارڈ دیا تھا اور یہ مال دو ہی سال میں خراب ہو گیا۔

مثال کے مادی خصوصیات کو الگ کرنے کے بعد سرکارِ دوعالم کی دونوں حیثیتوں کا سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ آپ بیک وقت کئی مدنی عربی اور ہاشمی بھی ہیں اور اللہ کے نبی و رسول بھی۔ لیکن مالکِ کائنات نے تمام حیثیتوں کو نظر انداز کر کے صرف رسالت کو باقی رکھا ہے۔

بتانا یہ ہے کہ اس چھاپ کو دیکھنے کے بعد مادی حیثیتوں پر نظر کرنا خلافِ عقل و انصاف ہے۔ اب تم یہ نہ دیکھو کہ یہ عبد اللہ کافر زندہ ہے بلکہ کے گھروں میں پیدا ہوا ہے، ہاشمی گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، عربی زبان میں کلام کرتا ہے۔ بلکہ صرف یہ دیکھو کہ یہ ہمارا رسول ہے، ہمارا نمائندہ ہے، ہمارا فرستادہ ہے، ہمارے دستِ قدرت کا سنوارا ہوا ہے۔ اس کی ذات اس کے صفات اور اُس کے کردار پر ہماری چھاپ ہے۔ اسے ہم نے اپنا بنا لیا ہے اسے ہم نے اپنی ذات کے ساتھ مخصوص کر لیا ہے۔

اب اگر اس میں حُسن ہے تو ہمارا ہے اور تمہاری نظر میں کوئی برائی ہے تو اُس کی نہیں وہ بھی ہماری ہی ہے۔ اب تمہاری عقل اور تمہاری سمجھ ہے کہ تم ہماری مخصوص صنعت میں عیب نکال سکو۔

یاد رکھو! دنیا میں ہر صناعت اپنی صنعت کی ضمانت لیتا ہے۔ میں نے

بھی اپنی صنعتِ خاص کی ضمانت لی ہے۔ یہ کوئی بے عقل مصنوع نہیں ہے کہ اس کی مادی پائیداری کی ضمانت لی جائے۔ یہ صاحبِ عقل و ہوش ہے۔ یہ صاحبِ فکر و نظر ہے۔ اس لیے میں نے اس کے جسم کی بقا کی بھی ضمانت لی ہے اور اس کے فکر و نظر کی سلامتی کی بھی ضمانت لی ہے۔ اہل دنیا ظلم و جور کا نشانہ نہ بنائیں تو اس کے جسم میں ضعف نہیں آسکتا اور ساری دنیا مل کر اس کی فکر و نظر پر حملہ کرنا چاہے تو اسے مجروح نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ جسم تک اہل دنیا کے رسائی ہے، وہ اسے مجروح اور زخمی بنا سکتے ہیں اور روح تک کسی کی رسائی نہیں ہے اس کا براہِ راست ہم سے رابطہ ہے۔

تم نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اپنے حبیب کے کردار کی ضمانت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

دنیا کے انسان، دو قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کے قول ہی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ دن بھر جھپٹاؤں میں کیا کرتے ہیں اور بے ربط دعویٰ میں دل کو بہلایا کرتے ہیں، اور کچھ وہ ہوتے ہیں جو مقامِ قول میں صداقت و دیانت سے کام لیتے ہیں، لیکن منزلِ عمل میں ان کے قدم میں لغزش آجاتی ہے۔ ہم نے اپنے حبیب کے کردار کی ضمانت میں دونوں باتوں پر نظر رکھا ہے قول کی ضمانت لی ہے تو اعلان کر دیا ہے:-

”وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَّحْيٌ وَّ بُرْهَانٌ“

(سورہ والنجم آیات ۳-۴)

اور کردار کی ضمانت لی تو صاف کہہ دیا :

”وَمَا زَمِنْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ“

”میرے حبیب! یہ سنگزیرے تم نے نہیں پھینکے ہیں، یہ

سنگزیرے (ہم) اللہ نے پھینکے ہیں۔“

نبیؐ کا قول ہمارا قول ہے، نبیؐ کا فعل ہمارا فعل ہے، نبیؐ کا عمل

ہمارا عمل ہے، نبیؐ کی رفتار و گفتار ہماری رفتار و گفتار ہے خیردار!

میرے حبیب کے کردار پر کوئی اعتراض نہ کرنا۔ اب یہ اس کا کردار نہیں ہے،

یہ ہمارے اشارہ وحی کے نمونے ہیں جو اس کی زندگی میں ظاہر ہو رہے ہیں

وہ کسی کی تعریف کر رہا ہے تو گویا ہم کر رہے ہیں۔ وہ کسی کی مذمت کر رہا ہے تو

گویا ہم کر رہے ہیں۔ وہ کسی کو اپنے کا ندھے پر بٹھا رہا ہے تو وہ بھی ہمارا ہی عمل

ہے اور کسی کو محض سے اٹھا رہا ہے تو وہ بھی ہمارا ہی اشارہ ہے۔

دل چاہتا ہے کہ عرض کروں میرے مالک دنیا کے صنّاع جب اپنے

مال کی ضمانت لیتے ہیں تو ایک گارنٹی کارڈ بھی دیتے ہیں تاکہ اگر کبھی

مال میں کوئی عیب نظر آئے یا کوئی نقص پیدا ہو جائے تو اُس کارڈ کو دکھلا کر

مالک سے محاسبہ کر سکیں تو نے اپنی صنعتِ خاص کی ضمانت کے بارے

میں کیا انتظام کیا ہے۔ تیری ضمانت کا ثبوت کیا ہے۔

عجب نہیں قدرت جواب دے۔ تو نے غور نہیں کیا۔ میں نے اپنی

صنعت پر مختلف مہر لگا دی ہیں۔ اس کے دوام و استحکام کی مختلف

نشانیوں مقرر کر دی ہیں۔ دیکھ اس کی پشت پر نبوت کی مہر ہے اس کی

انگلیوں پر شق القمر کی مہر ہے۔ اُس کے قدم پر منزلِ قوسین کی مہر ہے اور اُس

ہاتھوں پر سنگریزوں کے تسبیح کی مہر ہے۔

ان سب باتوں کے علاوہ ایک ضمانت کی کتاب بھی ہے جس کا نام ہے قرآن۔ یہ خود رہے یا نہ رہے، یہ قرآن تمہارے درمیان رہے گا اور پریچ بن کر رہے گا۔ اب سے لیکر صبح قیامت تک، جب بھی نبوت کے کردار میں کوئی خرابی یا کمزوری نکل آئے، یہ قرآن میرے پاس لیکر آجانا، میں دیکھوں گا کہ تم نے میری صنعت میں کیا عیب نکالا ہے اور میرے حبیب کا کردار کتنا طیب و طاہر ہے۔

یاد رکھیے، دنیا کے کارخانوں کی طرف سے جو گارنٹی بک ملتی ہے، اُس میں ضمانت کی میعاد لکھی رہتی ہے۔ اس وقفہ کے درمیان مال میں عیب نکل آئے تو مرمت بھی ہو سکتی ہے، بدلا بھی جاسکتا ہے، اصلاح بھی ممکن ہے لیکن اس کے بعد کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی اور وہ گارنٹی بک بیکار تصور کی جاتی ہے۔

مالک کائنات کی ضمانت کا اندازہ اس سے بالکل مختلف ہے اس نے کردارِ رسولؐ کی ابدی اور دائمی ضمانت لی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ نبیؐ کو اٹھایا، لیکن قرآن کو نہیں اٹھایا، تاکہ مجھ پر ایمان رکھنے والوں کے پاس ایک دائمی سند رہے کہ میرے حبیبؐ کا کردار کتنا طیب و طاہر اور پاک و پاکیزہ ہے عزیزانِ محترم! دنیا کا اصول ہے کہ جب کسی مال پر کارخانے کی مہر لگ جاتی ہے تو اربابِ عقل و دانش مادہ کو نہیں دیکھا کرتے بلکہ کارخانہ کے اعتماد پر سودا کیا کرتے ہیں۔ مادہ اسباب کا تجزیہ کارخانے کی ضمانت کے

کھلی ہوئی توہین تصور کیا جاتا ہے۔

مالکِ کائنات بھی یہی سمجھنا چاہتا ہے کہ جب تک میں نے اپنے  
ضمانت کا اعلان نہیں کیا تھا تمہیں حق تھا، تم اس کی خلقت پر نظر کرتے  
اس کے خاندان کو دیکھتے۔ اس کے قوم و قبیلے کا جائزہ لیتے، لیکن جب ہم نے  
ضمانت لے لی تو اب تمہیں کسی بات پر نظر رکھنے کا حق نہیں ہے۔ اب تو صرف  
ہم پر اعتبار کا سودا ہے اور بس۔ !

یہاں تک آنے کے بعد میں دنیاۓ اسلام سے کہنا چاہتا ہوں کہ  
قرآن کریم میں ” وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ “ کا اعلان نہ ہوتا تو  
تم رسول کی بشری زندگی کا جائزہ لیتے، اس میں عیب نکالتے، ان کی صلح پر  
اعتراض کرتے، ان کی جنگ پر حملہ کرتے، ان کی تعظیم پر انگلیاں اٹھاتے، ان  
کے اخلاق کو نشانہ اعتراض بناتے۔ ان کے جسم میں برائی تلاش کرتے، ان کی  
عقل پر ہذیان کا شبہہ کرتے۔ لیکن جب رب العالمین نے ضمانت لے لی تو  
اب تمہیں کسی اعتراض کا حق نہیں ہے۔ اب تو صرف خدا پر بھروسہ کرنا پڑے گا  
اور اگر اعتراض کا شوق پیدا ہو، تجزیہ کی ہوس پیدا ہو تو یاد رکھنا کہ یہ نبی کے  
صلح و جنگ پر اعتراض نہیں ہے، یہ خدا کی صلح و جنگ پر اعتراض ہے۔ یہ  
رسولِ اکرم کے دماغ پر حملہ نہیں ہے، یہ مرکزِ وحی الہی پر حملہ ہے۔

یاد رکھو! کہ نبی پر حملہ کر کے تو اسلام بچا بھی لے جاتے لیکن خدا پر  
حملہ کر کے اسلام نہیں بچ سکتا اس لیے کہ بشریت کا پہلو نبوت کی زندگی  
میں تراشا جاسکتا ہے، وحی الہی میں بشریت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

بشریت اور نبوت کے امتیاز کا تحفظ ہی تھا جس نے سرکار  
 سید الشہداءؑ کو مدینہ چھوڑ کر کربلا جانے پر مجبور کر دیا۔ یزید دنیا کو سمجھنا  
 چاہتا تھا کہ حج بھی ایک انسان تھے، اُن کے پہلو میں بھی انسانی دل تھا۔ اُن  
 کے دل میں بھی انسانی خواہشات کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ اُنھوں نے یرب  
 کچھ ملک گیری کی ہوس میں کیا تھا۔ ان کا ڈھونگ مال و دولتِ دنیا کے  
 لیے تھا۔ رسالت کوئی شے نہیں ہے۔ وحی کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ صرف  
 قوم پر حکومت کا ایک جذبہ تھا جس نے ان الفاظ کے تراشنے پر آمادہ کیا تھا  
 اور فرزندِ رسولِ اشقلینؑ اپنی قربانی سے اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتے  
 تھے کہ جس کے دل میں حکمرانی کا جذبہ ہوتا ہے، جو قوم کی گردنوں پر سوار ہونا  
 چاہتا ہے، جو اپنے دل میں ملک و مال کی ہوس رکھتا ہے، وہ جان لینا جانتا  
 ہے۔ جان دینا نہیں جانتا اور میں جان دینے کے لیے آمادہ ہوا ہوں تاکہ  
 دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ جس نبیؐ کا واسطہ اور جس رسولؐ کا وارث تخت و تاج  
 کی ہوس سے بے نیاز ہو وہ رسولؐ کتنا پاکیزہ کردار ہوگا۔

حسین ابن علی علیہما الصلوٰۃ والسلام کا تھوڑے سے ساتھیوں  
 کے ساتھ عورتوں اور بچوں کو لیکر کربلا کی طرف نکل جانا کھلا ہوا اعلان تھا کہ  
 ہوسِ حکومت والے اس انداز سے نہیں نکلا کرتے۔ دولت کے طلبگار تنہا  
 ایک مسلم کو کوفہ نہیں بھیجا کرتے۔ ملک حاصل کرنے والے عورتوں اور بچوں کو لیکر  
 صحراؤں کا سفر نہیں کیا کرتے۔ لڑائی کی تیاری کرنے والے فوجِ دشمن کو پانی  
 نہیں پلایا کرتے۔ جنگ پر آمادہ ہونے والے دشمن کو دیکھ کر نہر کا کنارہ نہیں

چھوڑا کرتے۔ لیکن میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں، تاکہ دنیا پہچان لے کہ حکومت والوں کا انداز اور ہوتا ہے اور رسالت والوں کا انداز اور۔ جنگ کرنے کے اسباب اور ہوتے ہیں اور جہاد کرنے کے سلیقے اور۔ حکومت والے فوجوں پر فوجیں طلب کرتے ہیں اور رسالت والے چراغ بجھا کر ساتھیوں کو زخمت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ جنگ والے سپاہیوں کو جمع کرتے ہیں اور جہاد والے چھہہینے کے نیچے کو میدان میں لاتے ہیں۔

دین و مذہب کے تحفظ کا یہی جذبہ لیے ہوئے امام حسین علیہ السلام دوسری محرم کو صحرائے کربلا میں وارد ہو گئے۔ راستے میں حر کے لشکر نے روکا آپ نے حر کو سمجھایا لیکن لشکر نے ماننے سے انکار کر دیا آپ نے حر کے رسالے کے پیاسے انسانوں اور جانوروں کو سیراب بھی کیا لیکن اس کے باوجود دشمنوں کو رحم نہ آیا۔ صرف ایک حر کا دل تھا جو بار بار پیچ رہا تھا لیکن ابھی عزائم میں وہ پختگی نہیں آئی تھی کہ دولت و حکومت کو ٹھوکر مار کر چلا آتا۔ ابھی حر انہیں منزلوں میں ہے کہ امام کے سامنے نمازِ جماعت قائم نہیں کرتا، بلکہ خود امام حسین علیہ السلام کی اقتدار میں نماز ادا کرتا ہے۔ حسین کی اقتدار اور لشکر ابن زیاد کی سرداری۔ یہ کیسے ممکن ہے۔؟

یہ خیال آتا تھا کہ حر نے بڑھتے ہوئے امام حسین علیہ السلام کے گھوڑے

کی بجام پر ہاتھ ڈال دیا۔

فرزندِ رسول کو جلال آگیا۔ فرمایا: حر! تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے

یہ کیا کر رہا ہے؟

اصحابِ غصّے میں بھجے ہوئے اس منظر کو دیکھ رہے تھے، لیکن امام حسین علیہ السلام نے کوئی اقدام نہیں فرمایا، صرف ایک موثر فقرہ ارشاد فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حُر نے دبی آواز میں عرض کی:

فاطمہ کے لال! اگر آپ کی مادرِ گرامی فاطمہ زہرا نہ ہوتیں تو میں بھی جواب دیتا لیکن کیا کروں دخترِ رسول کی شان میں گستاخی نہیں کر سکتا۔

قافلہ آگے بڑھ گیا، لیکن حُر کے دل میں یہ کھٹک رہ گئی۔ حسین فرزندِ فاطمہ ہیں حسین کا خون بہانے کا مطلب فرزندِ فاطمہ کا خون بہانا ہے۔

حسین پر پانی بند کرنے کا مطلب ساقی کو تر کے لال کو پیسا سا رکھنا ہے۔ یہی جذبہ تھا جس نے شبِ عاشور حُر کو بیدار کر دیا اور صبح ہوتے ہوتے حُر، امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گیا۔

چلا تو اس انداز سے چلا کہ فوجِ دشمن کو امام حسین علیہ السلام کے پیاس یاد دلا کے چلا۔

ایک سپاہی سے پوچھا تو نے اپنے گھوڑے کو پانی پلا لیا ہے؟  
اُس نے کہا ہم برابر پانی پلا رہے ہیں، گرمی کی شدت سے جانور بیتاب ہو رہے ہیں۔

حُر نے ایک آہ سرد کھینچی۔ اللہ! فوجِ یزید کے جانور میرا بھوں اور ساقی کو ترکی اولاد پیاسی رہے۔

یہ کہہ کر آگے بڑھے گھوڑے پر سوار ہوئے، گھوڑے کو ایلرگانی تیزی سے بڑھے تھے کہ بیٹے نے آواز دی۔ باپ نے مڑ کر پوچھا کیا ارادہ ہے؟

کہا، آپ کے ساتھ قربان ہونے کا عزم ہے۔

بیٹے کو ساتھ لیا۔ امام کی خدمت میں پہنچے۔ اصحاب نے استقبال کیا  
حُمر نے دوڑ کر سر امام کے قدموں پر رکھ دیا۔ فرزندِ رسولؐ! کیا خطا معاف ہوگی؟  
امام حسین علیہ السلام نے فرمایا، حُمر، قدموں سے سر اٹھالے۔ حُمر، فرزندِ  
فاطمہؑ کو شرمندہ نہ کر۔

حُمر نے کہا مولا! جب تک میری خطا معاف نہ ہوگی، یہ سر نہ اٹھے گا۔  
امام نے فرمایا، اے حُمر! میں نے تیری خطا کو معاف کیا، میرے خدا  
نے معاف کیا۔ حُمر! اب تو سر اٹھالے۔

حُمر نے عرض کی مولا! مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلے آپ کا راستہ  
میں نے ہی روکا تھا آپ کے سامنے یہ مصائب میری ہی وجہ سے آئے ہیں۔  
آقا، سوچتا ہوں کہ اگر آج میں نے راستہ نہ روکا ہوتا تو آپ اس بلا کے  
بن میں کیوں آتے؟ اگر آپ نے میرے لشکر کو سیراب نہ کر دیا ہوتا تو آپ کے  
بچے العطش العطش کی آوازیں کیوں بلند کرتے۔

حُمر کا ایک ایک موئے بدن سرکارِ سید الشہداءؑ سے التماس کر رہا  
تھا۔ مولا، مرنے کی اجازت دیجیے۔

حُمر کے مسلسل اصرار پر امام حسین علیہ السلام تو کچھ نہ کہہ سکے، البتہ ہاشمی  
غیرت نے آواز دی۔ حُمر! یہ کیا کہہ رہا ہے؟ ارے کوئی نہ جان کو مرنے کے  
لیے بھیجتا ہے۔ سبکیسی نے فریاد کی حُمر! فرزندِ رسولؐ شرمندہ ہے کہ تیری کوئی  
خاطر نہ کرے گا، اب مرنے کا نام لے رہا ہے۔

حُسر کا ضمیر برابر اصرار کرتا رہا۔ اور آخر کار اجازت نہ ملنے پر حُسر نے آواز دی۔ فاطمہ کے لال! علی کے نورِ نظر! اے کریم ابنِ کریم! کیا غلام کی کوئی بات نہ مانیں گے؟

فرزندِ رسولؐ نے فرمایا: حُسر! اور کیا کہنا چاہتا ہے۔؟  
حُسر نے ہاتھ جوڑے، عرض کی، آقا! اگر مجھے مرنے کی رضا نہیں دیتے تو میرے بیٹے ہی کو جلنے دیجیے۔

اربابِ غیرت سوچیں، حسینؑ کے دل پر کیا گذر گئی ہوگی۔ اور مظلومیت کا کیا عالم ہوگا کہ حُسر جو ان بیٹے کو مرنے کی اجازت دلا رہے ہیں۔  
فرزندِ رسولؐ نے سر جھکا کر فرمایا، حُسر! اگر تیری یہی مرضی ہے تو جا میں نے اجازت دی۔

حُسر کے چہرے پر بنشاشت کے آثار دوڑ گئے۔ مسکرا کر بیٹے کو گلے سے لگایا، سر پر عمامہ باندھا، زرہ پہنائی، کمر سے تلوار لگائی، گھوڑے پر سوار کیا اور کہا، جا میرے لال خدا حافظ۔ بیٹا! جلتے ہو تو گلا کٹو دینا۔ میرے لال! آج تیری شہادت سے تیرا باپ فاطمہ کے لال کے سامنے سُرخرو ہوگا۔

بیٹا، باپ کو آخری سلام کر کے چلا، میدان میں آیا۔ جہاد کا سلسلہ شروع ہوا۔ دشمن میں جوشِ انتقام اُٹھا۔ ایک آواز آئی۔  
یہ ابھی ادھر سے لُٹ کر گیا تھا، اس نے لشکرِ یزیدی کی ساکھ خراب کی ہے، اس نے ہماری فوج سے علیحدگی اختیار کی ہے۔ اسے چاروں

طرف سے گھیر لیا جائے اور اس کے حکیم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں  
 حُسر کا فرزند یہ ساری آوازیں سُنتا رہا اور نہایت بے جگری کے  
 ساتھ مصروفِ کارزار رہا۔ آخر کار جب زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے  
 گرنے لگا تو باپ کو آواز دی۔

بیابا آئیے! غلام آپ کا آخری دیدار کرے۔  
 حُسر کے کانوں میں آواز آئی۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کمر کو کس کے  
 باندھا اور میدانِ کارِخ کیا۔ فرزندِ رسول کو خبر ملی۔

فسر ملایا، حُسر! تیرا کیا ارادہ ہے؟

حُسر نے کہا، آقا بیٹے نے یاد کیا ہے۔ اس کے سر ہانے چار بلا ہو  
 یہ سُنتا تھا کہ فرزندِ رسول کا دل تڑپ گیا، آواز دی حُسر! یہ کیا  
 غضب کر رہا ہے۔ ؟ ارے میرے وفادار شیر! یہ کیا ارادہ کر لیا ہے۔  
 حُسر! کیا اپنے سامنے جوان بیٹے کو ایڑیاں رگڑتے ہوئے دیکھے گا۔ ؟

حکیم امام سے مجبور حُسر نے دل کو سنبھالا، قدموں کو روکا، کلیجہ پکڑ  
 کر بیٹھ گئے۔ فرزندِ رسول اصحاب کے ساتھ بڑھے۔ حُسر کے جوان کا  
 لاشہ اٹھایا۔

دل چاہتا ہے عرض کروں، فاطمہ کے لال! کربلا کے مظلوم مسافر!  
 حُسر اپنے جوان کو ایڑیاں رگڑتے ہوئے نہ دیکھے گا، حُسر اپنے جوان کا  
 لاشہ نہ اٹھائے گا۔ لیکن مولا! اُس وقت کیا کیجیے گا جب علی اکبر کا  
 آخری وقت ہوگا۔ جوان کا سر آپ کے زانو پر سوگا۔ بیٹا ایڑیاں رگڑ رہا ہوگا

(۴)

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ •

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ •

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ  
وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ سَيِّدِنَا وَ  
مَوْلَانَا أَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَإِلَى الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ  
وَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى أَعْدَائِهِمْ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ أَمَا بَعْدُ  
فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ  
” وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ “

حضرت رب العزت اپنے حبیب کی عظمت و جلال کا اعلان کرتے ہوئے ارشاد فرما رہا ہے۔ ” اور محمد صرف میرا رسول ہے “ اور بس۔ رسالت کے علاوہ اس کی زندگی میں اور کسی پہلو کا تلاش کرنا اس کی عظمت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ یہ میرا ہے اور صرف میرا ہے میرے علاوہ اس کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے اور جو رشتہ ہے اس پر میرے

رشتے کی چھاپ ہے۔ یہ پہلا میرا ہے اس کے بعد کسی اور کا ہے اور جس کا بھی ہے میرے ہی رشتے سے ہے۔ مجھ سے رشتہ توڑنے کے بعد کوئی اس سے رشتہ قائم کر لے، یہ ناممکن ہے۔ اور اس کی رسالت کا سہارا لیے بغیر کوئی مجھ تک پہنچ جائے یہ بھی ناممکن ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ اس حقیقت کا اعلان ان لفظوں میں بھی ہو سکتا تھا جن لفظوں میں ہم عام طور سے حضور سرور کائنات کی رسالت کی گواہی دیتے ہیں اور قرآن مجید نے بھی دوسرے مقام پر تذکرہ کیا ہے۔ یعنی

” مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ “ (سورہ بقرہ)

لیکن نہ جانے کیا مصلحت الہی ہے کہ اُس نے اس مقام پر رسول کی رسالت کا اعلان کرنے کے بجائے رسالت کے حصر کا اعلان کیا ہے اور یہ نہیں کہا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، بلکہ یہ اعلان کیا کہ محمد صرف اللہ کے رسول ہیں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

اس نکتہ کا اندازہ کرنے کے لیے پہلے یہ سوچنا پڑے گا کہ ان دونوں لہجوں کا فرق کیا ہے اور عرب کس مقام پر کس لہجہ کو اختیار کرتے ہیں۔ آپ عربی زبان کا جائزہ لیتے چلے جائیے، آپ کو یہ بات محسوس ہو جائے گی کہ عرب جب بھی کسی بات پر زور دینا چاہتے ہیں اور اس کی غیر معمولی عظمت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو وہاں یہی لہجہ اختیار کیا جاتا ہے۔

زید کو عالم کہنا بھی اس کے علم کا اعلان ہے اور صرف عالم کہنا بھی لیکن فرق یہ ہے کہ عالم ہونے کے ساتھ دوسرے حالات و کیفیات کا

احتمال رہ جاتا ہے جو علمی زندگی کو مشکوک و شبہ اور کمزور بنا دیتا ہے۔ لیکن صرف عالم ہونے کے بعد ایسا کوئی امکان نہیں رہ جاتا اور اب یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کا ہر پہلو علمی ہے۔ یہ اٹھتا ہے تو عالمانہ انداز سے، بدیٹھتا ہے تو عالمانہ طریقے سے، سوچتا ہے تو عالمانہ رنگ میں اور بات کرتا ہے تو عالمانہ لہجے میں۔

قرآن حکیم نے بھی قدم قدم پر اشیاء کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے یہی لہجہ اختیار کیا ہے۔ یہ بات تو بہت آسان ہے کہ ہم نے انسان کو اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے لیکن یہ بات بہت بلند ہے کہ ہم نے اس کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ بندگی کے لیے پیدا کرتے ہیں غیر بندگی کا امکان پایا جاتا ہے۔ لیکن صرف بندگی کے لیے پیدا کرنے میں ایسا کوئی امکان نہیں ہے۔

سرکارِ دو عالم نے بھی مالک کائنات کی عظمت کا تعارف کراتے ہوئے مکہ کی گلیوں میں جو نعروں بلند کیا تھا وہ اسی لہجے میں تھا۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ خدا کو موجود یا ایک مانو۔ بلکہ آپ کا مطالبہ یہ تھا کہ سوائے خدا کے کسی کو خدا نہ مانو۔ خدا کو ایک ماننا اور سوائے خدا کے کسی کو خدا نہ ماننا۔ لہذا ہر ایک ہی چیز ہے لیکن اس میں ایک ذہنی تربیت کا نکتہ ہے جس کے بغیر اسلام اپنی تربیت میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

خدا کو ایک ماننے کا عقیدہ خدا کی طرف متوجہ تو کر سکتا ہے اس کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کاسکتا ہے۔ اس کی بارگاہِ نیاز میں سجدہ

کر سکتا ہے لیکن غیر خدا کے سامنے سر بلند نہیں کر سکتا۔ اسلام ہی چاہتا ہے کہ بندہ اپنی زندگی اس درمیانی راستے سے گزارے کہ بندوں کا سامنا ہو تو سرفراز و سر بلند ہو جائے اور مالک کی بارگاہِ نیاز میں آجائے تو سجدہ میں سر جھکا دے۔

ذہن پر عقیدہ رُبوبیت کا بار بھی رہے اور دل و دماغ غیر کی بندگی سے آزاد بھی ہو جائیں۔ دماغ کو سکون بھی مل جائے اور دل سر بسجود بھی ہو جائے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی تراش و خراش اور اس کے لہجہ و انداز نے ذہنِ مسلم کو نظریات و افکار کی اس بلندی تک پہنچا دیا ہے جہاں خدا کے علاوہ کوئی چیز ذہن میں سماتی ہی نہیں ہے وہ کائنات کی جس شے پر نظر ڈالتا ہے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی صفت میں پتے برابر ہی پاتا ہے شمس و قمر ارض و سما، لیل و نہار، دشت و جبل، انسان و حیوان کوئی ایسا نہیں ہے جس کے سامنے سر تسلیم خم کیا جائے اور اس کی خدائی کا اقرار کیا جائے وہ پہاڑوں کی بلندی کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دریاؤں کی روانی کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، لیل و نہار کی آمد و رفت کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، شمس و قمر کی تابانیوں کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کوئی خدا نہیں ہے اور جب ان میں کوئی خدا نہیں ہے تو، نہ ان سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ ان کے مقابلے میں احساسِ کمتری کا شکار ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ اپنی تمام قوتوں، ذخیروں اور رعنائیوں کے ساتھ اُس

خدا کی مخلوقات ہی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے کہ انہیں عقل و خرد سے محروم رکھا ہے اور مجھے عقل کی بلند یوں سے بہرہ ور کیا ہے۔ یہ اپنا درد دل سنا نہیں سکتے اور میں ماجراتے زندگی بیان کر سکتا ہوں۔ یہ بندگی کے احساس سے بھی محروم ہیں اور مجھ میں عبد و معبود کے رشتے باقی ہیں۔ یاد رکھیے جس لہجہ و انداز میں مرسل اعظم نے رب العالمین کے عظمت کا اعلان کیا ہے۔ اسی لہجہ میں مالکِ کائنات نے اپنے حبیب کی پاکیزہ سیرت کا تعارف کرایا ہے۔ اب اس کی زندگی میں رسالت کے علاوہ کوئی پہلو تلاش نہ کرنا۔ یہ رسول ہے اور صرف رسول ہے اور میرا رسول ہے۔

اتنا فوق ضرور ہے کہ میری حیات کوئی مادی حیات نہ تھی، میرا رشتہ مادی رشتہ نہیں تھا، میری زندگی زبان و مکان اور جسم و جسمانیات سے بالاتر تھی۔ میں "لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُولَدْ" حیثیت کا مالک تھا اس لیے میری زندگی اور میرے افعال میں مختلف حیثیتیں نہیں نکالی جا سکتی تھیں۔ میرے دشمنوں نے میری عظمت کو کھٹانے کے لیے کفر و شرک کا پہلو نکالا، کبھی میرے وجود ہی کا انکار کر دیا گیا اور کبھی میرے مقابلے میں دوسرے خدا لاکھڑے کر دیے گئے۔ اب میرے رسول کا فرض تھا کہ وہ میری عظمت کا اعلان کرتے ہوئے میری توحید کا تحفظ کرے اور یہ بتائے کہ مجھ جیسا کوئی دوسرا خدا ممکن نہیں ہے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور تجھ کھا کر، کانٹوں پر چلی کر، لہو میں نہا کر، مد صائب اٹھا کر ایک ایک

گلی اور ایک ایک کوچہ میں اعلان کر دیا۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ وہ کائنات کا خالق و مالک ہے اور سب اسی کی مخلوق ہیں، اور رسولؐ کی زندگی سیکڑوں مادی رشتوں میں گرفتار تھی اس کی زندگی کے بارے میں شرک کے امکانات بیشمار تھے۔ اس کے کردار کو متعدد جہتوں سے مشکوک بنایا جاسکتا تھا اس کے اعمال کے تقدس پر بیشمار اعتراض کے پہلوزکا لے جاسکتے تھے اور میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے علاوہ دوسرا نبی نہیں ہے۔ میں نے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے ہیں۔ میں نے آدم سے لیکر خاتم تک مرسلین کا ایک سلسلہ قائم کیا ہے۔ میں نے ہر دور میں ہدایت کا ایک معقول انتظام کیا ہے میں یہ کیونکر کہہ سکتا ہوں کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نبی نہیں ہے۔ اور نہ دوسرے کے نبی ہونے سے میرے نبی کی عظمت پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے۔ میرے علاوہ دوسرا خدا ہو جائے تو ساری خدائی باطل و بیکار ہو جائے۔ نبی کے علاوہ دوسرے نبی ہیں۔ اور ان کی نبوت و رسالت پر کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ سید المرسلین بھی ہیں اور خاتم النبیین بھی، وہ نمائندہ الہی بھی ہیں اور صاحب کتاب و شریعت بھی۔ دشمن نے بھی ان کے بارے میں دوسرے انبیاء کے عقیدے کو ان کی توہین و تذلیل کا ذریعہ نہیں بنایا۔ بلکہ کھلے ہوئے دشمنوں نے سرے سے ان کی نبوت کا انکار کیا:۔

”يَقُولُوا الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا“

اے میرے حبیب! کفار یہ ”کہتے ہیں کہ آپ (ہمارے) رسول نہیں ہیں۔“

اور چھپے ہوئے منافق دشمن نے اس کی زندگی کی پاکیزگی اور اس کے کردار کی عظمت کو مجروح بنایا۔ اب میرا فرض ہے کہ میں دونوں طرف پہرے بٹھا کر اس کی عظمت کا تحفظ کروں اور ہر جہت سے اُس کے کردار کو پاکیزہ ثابت کروں۔ میں نے ایک لفظ میں دونوں فرض ادا کر دیے۔

”وَمَا هُمْ بِدَالٍ إِلَّا سُرُورٌ“

لفظ سُرُور نے واضح کر دیا کہ یہ خدائی نمائندہ اور اس کا فرستادہ ہے اور نفی و اثبات کے لہجے نے ثابت کر دیا کہ اس کی زندگی میں رسالت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس کا ہر عمل رسالت ہے اور اس کا ہر قدم رسالت۔

یہاں تک آنے کے بعد ایک فقرہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اربابِ حکمت کا یہ اصول ہے کہ شخصیت پر جس رُخ سے اعتراض کیا جاتا ہے اسی رُخ سے جواب کا بھی انتظام کیا جاتا ہے اور شخصِ حکیم کا جواب خود اس بات کی دلیل بن جاتا ہے کہ اعتراض کس رُخ سے آیا ہے اور شُبہ کس جہت سے پیدا کیا گیا ہے۔ آپ کسی شخص کے علم پر زور دیں تو ہم بغیر بتائے یہ سمجھ لیں گے کہ لوگ اس کے علم میں شُبہ کر رہے ہیں سخاوت میں نہیں۔ اور سخاوت پر زور دیں تو ہم سمجھ لیں گے کہ اس کی سخاوت مشکوک سمجھی جا رہی ہے علم نہیں۔

یعنی یہی حال اربابِ حکمت کے لہجہ کلام کا ہے کہ کلام کا لہجہ خود ہی

غمت ازی کر دیتا ہے کہ اہل باطل کس رُخ سے شبہ پیدا کر رہے ہیں اور بات کہاں سے کہاں جا رہی ہے۔

لا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ دلیل ہے کہ دشمنِ خدا نے وحدانیت پر اعتراض کیا تھا اور مسلِ اعظم نے واضح کر دیا کہ دوسرے خدا کا تصور برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ خدا ایک ہے اور بس ایک۔ نہ دوسری کائنات ہے نہ دوسرا پیدا کرنے والا۔ نہ کوئی دوسرا نظام ہے اور نہ اس کا چلانے والا اور ”وَهَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ“، دلیل ہے کہ دشمن رسالت نے کردارِ نبی پر حملہ کیا تھا، اور اس میں مختلف پہلو نکال کر کردار کے تقدس کو مجروح کرنا چاہا تھا۔ اور خدائے کریم نے واضح کر دیا کہ یہ صرف رسول ہیں اب ان کی زندگی میں رسالت کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

اسی کی روشنی میں یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُحد کے میدان میں مسلمانوں کے فرار کے باوجود مولائے کائنات علی بن ابی طالب علیہ السلام کے جہاد میں شبہ کیا جا رہا تھا اور آگے چل کر یہ کہنے کا جواز نکالا جا رہا تھا کہ اُحد تنہا علی علیہ السلام نے فتح نہیں کیا بلکہ اس میں ہمارا بھی ہاتھ ہے۔

زبانِ وحی سے بہتر اس سازش کو کون سمجھتا۔ اس نے روزِ اول ہی مسئلہ کو صاف کر دیا۔ ”لَا فَتٰی اِلَّا عَلٰی“ علی کے علاوہ کوئی جوان نہیں ہے۔ اب نہ کہنا کہ دوسرے افراد بھی اُحد کے معرکے کو سر کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ میدان کو فتح کرنے کے لیے فتی کی ضرورت ہے اور علی علیہ السلام کے علاوہ کوئی فتی نہیں ہے۔

اربابِ کرم لہجہ کو لہجہ سے ملائیے تو کلام کا لطف سمجھ میں آئے گا۔  
 ”وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ وَحَدَّ لَا شَرِيكَ لَهُ کے علاوہ کوئی خدا  
 نہیں ہے اور ”لَا فَتَى إِلَّا عَلِيٌّ“ (علی علیہ السلام کے علاوہ  
 کوئی جوان نہیں ہے۔)

اب نہ دوسرے خدا کا عقیدہ جائز ہے اور نہ دوسرے جوان  
 کا تصور۔ ماننا پڑے گا کہ جس طرح ایک خدا سے یہ کائنات چل رہی  
 ہے ویسے ہی ایک علی علیہ السلام سے جہاد کی فتح چل رہی تھی۔

میں نے عرض کیا کہ مرسلِ اعظمؐ کی حیات پر کفر و نفاق نے دُہرے حملے  
 کیے کفر نے رسالت کا انکار کیا اور نفاق نے زندگی میں دوسرے گوشے  
 تلاش کیے اور یہی دونوں باتیں یزید کے ایک شعر میں نظر آتی ہیں : یعنی  
 (یہ سب بنی ہاشم کا کھیل ہے ، نہ کوئی وحی آئی ہے نہ خبر)

وحی اور خبر کا انکار کھلا ہوا رسالت کا انکار ہے۔ اور ہاشمیت کا  
 حوالہ دلیل ہے کہ یزید، محمد مصطفیٰؐ کے پاکیزہ کردار کو ہاشمی اثرات کے حوالے کرنا  
 چاہتا تھا۔ سرکارِ سید الشہداءؑ نے آواز دی۔ یزید! سرکٹ جلے یہ  
 ممکن ہے لیکن رسالت مٹ جائے یہ ناممکن ہے۔ اسلام بدنام ہو جائے یہ  
 غیر ممکن ہے۔ یزید! تجھے نہیں معلوم کہ تو فوجوں کی کثرت میں کفر و اسلام کے  
 معاملہ کو چھپا کر بنی ہاشم و بنی امیہ کی جنگ کو جنگِ اقتدار بنا چاہتا ہے  
 اور میں غریب الوطن ہو کر کربلا کے جنگل میں گلا گٹا کر دنیا پر واضح کر دینا چاہتا  
 ہوں کہ اقتدار کی جنگ کا نقشہ اور موتا ہے اور حق و حقانیت کے بچانے

کا نقشہ اور۔

سرکارِ سید الشہداء نے یزید کی مہم کو ناکامیاب بنانے کے لیے جہاں اور انتظامات کیے وہاں ایک اہم انتظام یہ بھی کیا تھا کہ آپ نے تھوڑے سے آدمی اپنے ہمراہ لیے، لیکن مختلف قبیلوں سے لیے، مختلف خاندانوں سے لیے، مختلف جگہوں سے لیے، تاکہ جہادِ حق، جنگِ ملک گیری نہ بننے پائے، اور مجاہدینِ راہِ خدا کو اقتدار پرست نہ کہا جاسکے۔

اس سے بالآخر ایک انتظام یہ بھی تھا کہ حسین نے اپنی مظلومیت کے سہارے مختلف مذاہب کے افراد کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔ کبھی گروہِ یاہل سے زُبیر کو نکالا، کبھی عیسائیت کے دامن سے وہب کو نکالا، کبھی یزیدیت کی فوج سے حُر کو نکالا، تاکہ آنے والی قومیں کربلا کی تاریخ پر نہیں تو انھیں یہ اندازہ رہے کہ ایک مذہب کے دو بادشاہوں کی لڑائی میں دوسرے افراد اپنا مذہب چھوڑ کر ساتھ نہیں دیا کرتے اور دنیا کا کوئی صاحبِ عقل مظلوم کی ہمدردی میں اپنا دین نہیں چھوڑ دیا کرتا۔ یہ حسینی تدبیر تھی جس نے تاریخ کا منہ بند کر دیا اور الزام تراشی والوں کی زبانوں پر قفل لگا دیے۔

اب نہ کہنا، یہ دو بادشاہوں کی جنگ تھی۔ یہ دو مسلمانوں کی لڑائی تھی۔ خبردار! میرے ساتھیوں کا کردار آواز دے رہا ہے کہ حسینِ حفاظتِ حق کے لیے جہاد کر رہے تھے، حسین بقاءِ اسلام کے لیے اٹھے تھے۔ اس لیے جب ہم نے مقصد کی بلندی کو پہچان لیا تو راحت و آرام کو ٹھوکر مار کر بیکیں حسین کے قدموں میں آگئے۔ اور اپنی آسائش کا کوئی خیال نہیں کیا۔

اربابِ عزا! اب ذرا سوچیں۔ کوئی انسان جس کی عمر جوانی کی عمر ہو  
 نئی نئی شادی کی ہو اور دلہن کو رخصت کر کے اپنے گھر لے جا رہا ہو،  
 اس کے جذبات، اس کی تمنائیں اور اس کی اُمنگیں اس بات کی اجازت  
 دیتی ہیں کہ وہ اپنی لذتِ حیات کو قربان کر کے ایک غریب الوطن کے ساتھ  
 ہو جائے، اپنے نشاطِ زندگی کو خیر باد کہہ کے ایک سبکیں بے دیار پر اپنی جان  
 قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ نہیں نہیں۔ یہ صرف حیثیت کی  
 حقانیت کی کشش تھی جس نے وہیب کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور ایک منزل  
 پر وہیب اپنی ضعیف ماں اور زوجہ کے ساتھ فرزندِ رسولؐ کی خدمت میں  
 حاضر ہو گئے۔

تاریخ کا بیان ہے کہ جب سرکارِ سید الشہداءؑ کا قافلہ مکہ سے کربلا  
 کی طرف جا رہا تھا تو راستہ میں ایک چھوٹا سا قافلہ نظر آیا جس میں صرف  
 تین افراد تھے۔ ایک ضعیف ماں، ایک بیٹا اور ایک اس کی زوجہ۔ ایک  
 منزل پر قیام کے بعد ماں کے دل میں خیال پیدا ہوا اور اس نے کہا:  
 بیٹا! ذرا جا کر یہ دریافت کر کہ یہ قافلہ اس لوڈھوپ کی شدت  
 میں گھر سے کیوں نکل آیا۔ آخر یہ کون لوگ ہیں اور کہاں کا ارادہ رکھتے ہیں؟  
 ان کے قافلے میں تو چھوٹے چھوٹے بچے بھی معلوم ہوتے ہیں، ان کے ساتھ  
 خواتین کی بھی ایک جماعت ہے۔ آخر انھوں نے اس موسم میں گھر کیوں چھوڑ دیا؟  
 کون سی ضرورت تھی جس نے انھیں اس طرح غریب الوطن کر دیا۔

بیٹے نے ماں کا حکم سنا اور دوڑ کر قافلہ کے قریب آیا۔ کسی سے دریافت

کیا، بھائی! یہ کس کا قافلہ ہے؟ کہاں سے آ رہا ہے؟ اور کہاں کا قصد ہے؟ اس قافلے نے اس موسم میں کیوں گھر چھوڑ دیا؟ اور کیا ان لوگوں کے پاس کوئی منزل نہیں ہے جو بچوں اور عورتوں کو سیکر نکل پڑے ہیں۔

یہ سننا تھا کہ ایک ساتھی نے بڑھ کر آواز دی۔ بھائی! کچھ خبر نہیں ہے یہ مسلمانوں کے رسول کے نواسے حسین بن فاطمہ کا قافلہ ہے، جسے امت نے مدینہ میں رہتے نہیں دیا اور اب مکہ معظمہ سے بھی جدا ہو کر صحرا نوردی میں مصروف ہے۔ اے بھائی! اس قافلے کی ”بظاہر“ کوئی منزل نہیں ہے لیکن یہ موت کی طرف جا رہا ہے اور موت اسے لیے جا رہی ہے۔ رسولِ اسلام کا نواسہ غریب الوطن ہو کر اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ لو اور دھوپ کی شدت میں مدت سے یونہی سرگرم سفر ہے۔

وہب نے یہ تقریر سنی اور دوڑ کر آئے۔ کہنے لگے مادرِ گرامی! غضب ہو گیا۔ یہ تو مسلمانوں کے رسول کا نواسہ ہے جسے امت نے اس طرح ستایا کہ اس کا وطن بھی چھوٹ گیا ہے۔ اماں! کسی قوم نے اپنے رسول کی اولاد کو اس طرح نہیں ستایا ہے۔ اماں! اس زندگانی دنیا پر خاک ہے۔ یہ اللہ کا مقرب بندہ در بدر کی مٹھو کریں کھائے اور ہم لوگ اپنے گھر کو جائیں۔ یہ ناممکن ہے۔ چلیے! اس غریب الوطن کا ساتھ دیں۔ عزا دارو! یہ سن کر مادرِ وہب اپنے فرزند کو لیے ہوئے فرزندِ رسولِ الثقلین کی خدمت میں آئی اور تیوں اسلام کے دائرے میں آگئے حسدیت نے خاموش تبلیغ کی اور وہب عیسائیت سے نکل کر اسلام کے دامن میں

آگیا۔

اب یہ قافلہ حسین ابن علیؑ کے ساتھ ہے یہاں تک کہ دوسری محرم کو حسین وارد سرزمینِ کربلا ہوئے۔ ساتویں محرم سے پانی بند ہوا۔ نویں محرم کو حسین چاروں طرف سے فوجوں سے گھر گئے اور یہ قافلہ حسین کے ساتھ مصائب میں برابر کا شریک رہا۔ یہاں تک کہ عاشور کا دن آگیا اور ایک مرتبہ ماں نے بیٹے کو بلا کر کہا: میرے لال! سنتے ہو، آج قربانیوں کا دن ہے آج ہر ماں اپنے نورِ نظر کو اپنے مولا پر قربان کرے گی۔ بیٹا! ایسا نہ ہو کہ کسی سیرانی کا لال قربان ہو جائے اور تم زندہ رہو۔ بیٹا! ایسا ہو گا تو محشر میں شہزادی زہراؑ کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ جاؤ میرے لال، آقا سے اجازت طلب کرو اور سب سے پہلے اجازت لے کر میدان میں جاؤ۔ بیٹا! آج تو ایک ہی تمنا ہے کہ تم خون میں نہاؤ اور میں دکھیوں۔ تم گلا کٹاؤ اور میں مولا کی بارگاہ میں سرخرو ہو جاؤں۔ تم قتل ہو جاؤ اور میں اپنی شہزادی فاطمہ زہراؑ کو آواز دوں۔ شہزادی! یہ آپ کا غلام آپ کے نورِ نظر پر قربان ہو گیا۔

ماں کا حکم ملا۔ وہ بچلے۔ امام کی خدمت میں آئے، دستِ ادب جوڑ کر عرض کی۔ مولا! مجھے اماں نے بھیجا ہے۔

وہ بچ! خیر تو ہے کیوں بھیجا ہے؟

عرض کی آقا! آپ سے اذنِ جہاد لینے کے لیے بھیجا ہے۔ آقا! میری ماں کی تمنا ہے کہ میں ان کی نگاہوں کے سامنے خون میں تہالوں۔ میری ماں کی آرزو ہے کہ میں آپ کے قدموں پر سر قربان کر دوں۔ آقا! اجازت ہے

حسینؑ نے سر اٹھا کر سر سے پیر تک وہب کو دیکھا۔ دل نے آواز دی، وہب یہ اپنی موت کی خبر سنانے کے لیے میں ہی رہ گیا تھا بلے، یہ جوانی اور یہ مرنے کی آرزو۔ یہ شباب اور یہ ثبوت کی ٹرپ۔ اللہ! حسینؑ کتنا غریب و سیکس ہو گیا ہے کہ اس سن و سال کے جوان بھی مرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ حسینؑ خاموش کھڑے ہیں اور وہب برابر اصرار کرتے جلتے ہیں۔ یہاں تک کہ مولانا نے اجازت دی۔

وہب مسکراتے ہوئے ماں کی خدمت میں آئے۔ اور کہنے لگے :  
 اماں! مرنے کی رضامند گئی۔ اماں! اب یہ آپ کا لال خون میں نہانے جا رہا ہے۔ آپ کی آرزوؤں کی تصویر خاک میں ملنے جا رہی ہے۔  
 ماں نے بیٹے کو غور سے دیکھا۔ اور خوش ہو کر فرمایا: جاؤ میرے لال جاؤ۔  
 خدا حافظ۔

وہب رخصت ہو کر میدان میں آئے۔ مصروف جہاد ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد متعدد دشمنوں کو فی النار کر کے خون میں نہا کر ماں کے سامنے آئے آواز دی۔ ”هَلْ رَضِيْتِ عَنِّي يَا اُمَّاهُ“  
 مادرِ گرامی! اب تو خوش ہو گئیں؟

ماں نے یہ سنا اور منہ پھیر لیا۔ وہب نے پھر دوبارہ سوال کیا۔ ماں نے کوئی توجہ نہ کی۔ آخر کار بیٹے نے کہا: اماں! آپ کا لال خون میں نہا کر آیا ہے۔ اب تو رضا کی سند دیدیجیے۔

ماں نے ٹرپ کر کہا۔ میرے لال! زندہ میدان سے واپس آیا ہے،

اور ماں کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ جا جب تک سرتن سے جدا نہ ہوگا یہ ماں راضی نہ ہوگی۔

وہب نے ماں کا ارشاد سنا اور میدان کا رخ کیا۔ چلنے لگے تو دیکھا کہ درخیمہ پر زوجہ سر جھکائے کھڑی ہے گھبرا کے پوچھا، مومنہ! یہاں کیوں کھڑی ہے؟ اُس نے کہا، وارث! تم تو مرنے جا رہے ہو۔ یہ تو بتانے جاؤ کہ اس عالمِ غربت میں میرا کون ہوگا۔

ماں نے اس منظر کو دیکھ لیا۔ آواز دی بیٹا! زوجہ کے کہنے میں نہ آنا۔ وہب نے دامن چھڑکے چلنے کا ارادہ کیا۔

زوجہ نے کہا، والی! جب تک مولا کے پاس چل کے ان کے سامنے دو ایک باتوں کا وعدہ نہ کرو گے میں نہ چلنے دوں گی۔

وہب زوجہ کو لیے ہوئے آقا کی خدمت میں آئے۔ عرض کی مولا! یہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔

فرزندِ رسولؐ نے پوچھا مومنہ! کیا کہنا چاہتی ہے؟

اُس نے کہا، آقا! وہب میدان میں جا رہے ہیں۔ یہ ابھی شہید ہو جائیں گے اور جنت میں چلے جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ آپ کے سامنے وعدہ کریں کہ میرے بغیر جنت میں قدم نہ رکھیں گے۔

سردارِ جوانانِ جنتِ حسینؑ نے آواز دی مومنہ! یہ وہب سے کیوں کہہ رہی ہو۔ اس کا ذمہ دار حسینؑ ہے۔ میں کچھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہب تیرے بغیر جنت میں نہ جائیں گے۔

مولاکا یہ کرم دیکھنا تھا کہ ایک مرتبہ زوجہ وہب نے عرض کیا، آقا! اور ایک بات آپ سے بھی کہنا ہے۔ فرزندِ رسولؐ نے فرمایا، مومنہ! وہ کیا؟ اُس نے کہا، آقا! وہب میدان میں جا کر شہید ہو جائیں گے اور میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ اے عزت و ناموس کے محافظ آقا! مجھے شہزادیوں کی حد میں بھیج دیجیے تاکہ وارث کے بعد میرا پردہ تو رہ جائے۔

عزادارو! یہ سُننا تھا کہ امام کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگے۔ دل نے آواز دی، زوجہ وہب! تجھے کیا خبر؟ تو سمجھتی ہے کہ سیدانیوں کا پردہ رہ جائے گا؟ لیکن میں عصر کا منتظر دیکھ رہا ہوں۔ جب میری شہادت کے بعد خمیوں میں آگ لگے گی اور سیدانیوں کے سروں سے چادریں چھنی جائیں گی۔ بیبیوں کے کھلے ہوئے سر ہوں گے اور تماشائیوں کا مجمع، کوفہ و شام کے بازار ہوں گے اور آلِ حجر کی دربدری۔ ایک منادی آواز دیتا ہوا چلے گا۔

تماشائیو! تماشا دیکھو، یہ آلِ محمد قیدی بنا کر لے جائے جا رہے ہیں۔ یہ رسول اللہ کی بیٹیاں ہیں جن کے بازوؤں میں رسیاں بندھی ہوئی ہیں، اور یہ رسول اللہ کا لال ہے جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بٹریاں گلے میں طوقِ خار دار پڑا ہے۔

( اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ )

۵

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ  
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى  
 سَيِّدِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ سَيِّدِنَا أَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ  
 وَالِإِهْ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ وَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى أَعْدَائِهِمْ  
 أَجْمَعِينَ: أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ  
 ” وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ “

ملک کائنات کا ارشاد ہے کہ میرا حبیب جس کا اسم گرامی محمد ہے یہ  
 صرف میرا رسول ہے۔ اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ رسالت کیا ہے اور اس کے  
 معانی کیا ہیں۔ کسی انسان کے رسول ہونے کا کیا مطلب ہے اور اس کا رتبہ  
 کیا ہوتا ہے۔ ان امور کی وضاحت سے پہلے ایک نکتہ کی طرف آپ کے  
 ذہن کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے ان تمام  
 اُلجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے کیلئے صرف ایک جملہ استعمال کیا ہے۔  
 ”تَدْخَلْتُ مِنْ قَبْلِهِ السُّسُلُ“ اس کے پہلے بھی رسول

گذر چکے ہیں۔ یعنی نہ یہ انوکھا رسول ہے اور نہ اس کی نرالی رسالت ہے رسالت کیا ہے؟ یہ تمہیں معلوم ہے۔ رسول کیسا ہوتا ہے، اس کا تمہیں تجربہ ہے۔ اب یہ بحث غلط ہے کہ اس رسول کی حیثیت کیا ہے اور اس کا کردار کیا ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ جیسے تم نے رسولوں کو دیکھا ہے ویسا ہی بلند کردار اس رسول کا بھی ہے۔ یہ بحث الگ ہے کہ رسولوں میں اس رسول کا مرتبہ کیا ہے اور نمائندگانِ الہی میں اس کی منزل کیا ہے لیکن یہ بہر حال مسلمہ ہے کہ رسالت کے لیے جو کمالات و کرامات۔ جو عظمت و جلالت اور جو بلندی کردار ضروری ہے وہ سب اس رسول میں موجود ہیں۔ اگر تم نے تاریخ میں کوئی ایسا رسول دیکھا ہے جو جاہل اس دنیا میں آیا ہو۔ کوئی ایسا رسول دیکھا ہے جس کے کردار میں کوئی کمزوری رہی ہو۔ کوئی ایسا رسول دیکھا ہے جس کے آباء و اجداد کا کردار پاک نہ رہا ہو۔ کسی ایسے رسول کا تجربہ کیا ہے جو اولاد و اعزاء کی محبت میں جادہ حق اور صراطِ مستقیم سے ہٹ گیا ہو، تو اس رسول کی زندگی میں بھی ایسی کمزوریاں تلاش کرنا اور اگر تاریخ میں کسی رسول یا نبی کے کردار میں ایسی کمزوری نہیں ہے تو اس رسول کے کردار میں بھی کوئی عیب نہیں ہے۔ کردار رسالت میں عیب کا تلاش کرنا تاریخِ اسلام سے ناواقفیت اور حقائقِ قرآن سے جہالت کا نتیجہ ہے۔

حیرت ہے ان مسلمانوں پر جو آج رسولِ اعظم کے کردار میں زبردستی کمزوریاں پیدا کر رہے ہیں اور کسی نہ کسی طرح مرسلِ اعظم کو بھی اپنی سطح پر لانا چاہتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی نبی کی امت نے یہ طریقہ کار اختیار

نہیں کیا جو اُمتِ اسلامیہ اختیار کر رہی ہے۔ نبی تو نبی۔ دنیا کے دوسرے رہنماؤں اور دوسرے مذاہب کے سربراہوں کی تاریخیں پڑھیں۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہر قوم کی یہ کوشش رہی ہے کہ اپنے رہنماؤں کے کردار کو بلند سے بلند تر بنا کر پیش کرے۔ اگر کہیں کوئی کمزوری رہ گئی ہے تو اس کا انکار کر دیا جائے یا کم از کم تاویل کر کے دنیا کو مطمئن کیا جائے کہ سربراہِ قوم کے کردار میں کوئی عیب نہیں ہے۔ حد ہو گئی کہ دنیا کی دوسری قوموں نے اپنے رہنماؤں کے سلسلے میں ایسے ایسے واقعات بیان کیے ہیں جو کسی طرح عقل میں آنے والے اور قرینِ قیاس نہیں ہیں لیکن کسی قوم نے اظہارِ فضائل میں اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ دوسری قوم مانے گی یا نہیں، دوسرے لوگ باور کریں گے یا نہیں۔ انھوں نے اپنے رہنما کو جیسا مانا یا سمجھا بلا جھجک بیان کر دیا۔

یہ بد قسمتی تو صرف اُمتِ اسلامیہ کا حصہ ہے کہ وہ حقیقتوں کے اعلان میں غیروں کا منہ دیکھا کرتی ہے۔ اور جہاں دوسروں کے مزاج کو برسہم موتے دیکھا وہیں سے مذہب میں ترمیم شروع کر دی۔ انصاف سے بتائیے مذہب کے حق میں اُس سے بڑا دشمن کون ہو سکتا ہے جو قوموں کے ذہن کو بدلنے کے بجائے مذہب ہی کو تباہ و برباد کر دے۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ مذہب کی ذمہ داری اُن افراد نے سنبھال لی جن کے پاس تخت و تاج اور دولتِ دنیا تو تھی لیکن علوم و کمالات کا ذخیرہ نہ تھا۔ تخت و تاج سے عیش و عشرت کا سامان ہو سکتا ہے، علوم کی گتھیاں نہیں

سنبھائی جاسکتیں۔ یہ احسان تھا آل محمدؐ کا کہ انھوں نے تخت و تاج کو ٹھوکر مار کر بساطِ علم بچھا دی اور نازک سے نازک وقت میں مذہب کی عزت و آبرو کا تحفظ کیا۔ یہی وجہ تو ہے کہ آج تخت و تاج کے نشانات مٹ گئے لیکن علوم آل محمدؐ کے آثار چاروں طرف بکھرے نظر آ رہے ہیں۔

دنیا کی دوسری قوموں کو جانے دیجیے خود ان اقوام عالم کا جائزہ لیجیے جنہوں نے ہر دور میں مذہب کا نام لیا ہے اور کسی نہ کسی شکل سے اپنے مذہبی روایات کو زندہ رکھا ہے۔ ان ساری اقوام کا جائزہ صاف آواز دے رہا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں ان کا طرزِ عمل و طرح کار بہا ہے۔ بعض افراد نے انبیاء کو باقاعدہ اسی طرح تسلیم کیا ہے جس طرح انھوں نے اپنے کو پہنچنوا یا تھا، اور جس طرح خالق کائنات نے انھیں عہدہ نبوت سے سرفراز کیا تھا اور کچھ لوگوں نے سرے سے نبوت کا انکار کر دیا اور صاف اعلان کر دیا۔ تم ہمیں جیسے ایک انسان ہو اور پروردگار نے کوئی وحی وغیرہ نازل نہیں کی۔ کبھی یہ کہہ دیا کہ خدا کو وحی نازل کرنا ہوتی تو کسی بڑے آدمی پر نازل کرتا عزت زدہ لوگوں پر نہیں کبھی کسی لفظ میں۔ لیکن ہر دور میں ایسی ایک قوم رہی ہے جس نے صاف لفظوں میں انبیاء کی نبوتوں کا انکار کیا اور اس پر ایمان لانے کو قطعی غیر ضروری بلکہ مہمل خیال کیا ہے۔

مجھے اس بات سے بخت کرنا نہیں ہے کہ یہ لوگ اپنے خیال میں کس حد تک گمراہ تھے اور ان کی گمراہی کے اسباب کیلئے اتنے واضح معجزات کے باوجود انھیں دولتِ ایمان کیوں نہیں ملی اور ان کا دل نورِ یقین سے کیوں منور

نہیں ہوا اور نہ اس وقت ان افراد سے بحث کرنا ہے جو نبوتوں پر ایمان لائے اور انہوں نے انبیاء کی شخصیتوں کو پہچانا۔ معجزات کا اقرار کیا، عظمتوں کا اعتراف کیا اور صاف واضح کر دیا کہ تو را ایمان بہ دور میں باصلاحیت دلوں میں متور ہو سکتا ہے۔ مجھے ان حضرات کے ایمان اور اس کے درجہ سے بھی بحث کرنا نہیں ہے اور نہ آج اس کا محل ہے۔

اس وقت تو صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دورِ آدم سے آج تک انبیاء کے بارے میں دو ہی طرح کے نظریات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ مکمل اقرار یا مکمل انکار۔ سابق امتوں میں ایسا ضرور ہوا ہے کہ ایمان لانے والوں نے بھی انبیاء سے غداری کی ہے اور ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ان کے بارے میں غلط عقائد پھیلائے ہیں۔ لیکن کم از کم اتنا تو ہوا ہے کہ تاریخ نے ان کی شدید گرفت کی ہے اور اہل عقل و انصاف نے ان پر سے اپنا اعتماد اٹھا لیا ہے۔ لیکن یہ بد قسمتی صرف امتِ اسلامیہ کا حصہ ہے کہ یہ ایمان لانے کے بعد دو حصوں میں بٹ گئی اور اپنی تفریق پسند طبیعت سے خود نبوت کا بٹوارہ شروع کر دیا مجھے ان کفار و مشرکین سے کیا شکوہ ہو جنہوں نے سرے سے نبوت کے ماننے سے انکار کر دیا، یا مرسلِ اعظم سے برسرِ پر کار ہو گئے۔ ان کی جہالت و ضلالت تو صاف واضح ہے ان کی جہالت سے اسلام یا کردارِ بانیِ اسلام بدنام نہیں ہو سکتا۔ شکوہ ان مسلمانوں سے ہے جو اپنے کو اسلام اور بانیِ اسلام کا مخلص کہتے ہیں اور پھر پیغمبر کی زندگی سے اپنا اعتبار اٹھالیتے ہیں۔

میری نظر میں تاریخ میں آج تک کوئی ایسی قوم پیدا نہیں ہوئی جس نے اپنے نبی کی زندگی کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہو۔ ایک شریعت اور ایک سیاست ایک کا تعلق دنیا سے ہو اور ایک کا دین سے۔ یہ صرف امتِ اسلامیہ کا امتیاز ہے کہ اس نے نبی کریم کے کردار کو بھی پاک و پاکیزہ نہیں رہنے دیا اور کلمہ پڑھنے کے باوجود نبی کی زندگی پر اعتراض کرنے کے راستے نکال لیے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ رسول اکرم کی شخصیت کے دو شعبے ہیں۔ ایک آپ کی بشریت اور ایک آپ کی نبوت۔ مالکِ کائنات نے آپ کو نبی ضرور بنایا ہے لیکن انسان ہی کے بھیس میں۔ رسالت کا منصب ضرور عطا کیا ہے لیکن بشر بنانے کے بعد۔ اس لیے آپ کی زندگی میں دونوں چیزوں کے آثار ہونے چاہئیں۔ اگر ایک طرف رسالت و نبوت کی بلندیاں، عصمت و علم و کمال ہو، تو دوسری طرف بشریت اور انسانیت کی کمزوریاں بھی ہونی چاہئیں بغیر اس کے شخصیت کے دونوں پہلو نمایاں نہ ہو سکیں گے اور زندگی نامکمل رہ جائے گی۔

ان دونوں پہلوؤں کی حفاظت کے لیے مسلمانوں نے یہ راستہ نکالا ہے کہ مسلِ اعظم کی زندگی کے اعمال کو دو حصوں پر بانٹ دیا جائے، کچھ کام وہ رکھے جائیں جن کا تعلق دین اور شریعت سے ہو، جیسے نماز، روزہ حج، زکوٰۃ اور کچھ کام وہ قرار دیے جائیں جن کا دین و شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسے کھانا، پینا، سونا، جاگنا صلح و جنگ وغیرہ۔ نماز، روزہ صرف اہل دین و شریعت کیا کرتے ہیں لیکن کھانے پینے میں

تو دین دار اور بے دین برابر کے حصہ دار ہیں اسے دین کا مسئلہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔

زندگی کے اعمال کی اس تقسیم کے بعد دوسرا مرحلہ بالکل آسان ہو جاتا ہے جن اعمال کا تعلق دین و شریعت سے ہے ان میں رسول کو نبی و رسول تسلیم کر کے ان کی ہر بات کو مان لیا جائے اور جن چیزوں کا تعلق دنیا دار کی سے ہے ان میں آپ کو ایک عام انسان سمجھا جائے اور آپ کے احکام و تعلیمات پر خود غور کیا جائے اس لیے کہ جس طرح اللہ نے انھیں عقل دی ہے ویسے ہی ہمیں بھی اس جوہر سے نوازا ہے۔ جیسے فیصلہ کرنے کی قوت ان میں ہے ویسے ہی ہم میں بھی ہے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اپنی عقلوں کو معطل اور بیکار بنا کر ہر بات میں انھیں کے قول پر اعتماد کر لیں اور وہ جس طرح چاہیں ہمیں اپنی مرضی کے راستے پر چلائیں۔

ہم نے کلمہ ضرور پڑھا ہے، رسالت و نبوت کی گواہی ضرور دی ہے۔ انھیں اللہ کا رسول ضرور مانا ہے لیکن ان تمام باتوں کا تعلق دین و شریعت سے ہے۔ دنیاوی زندگی کے مسائل میں انھیں رسول و نبی نہیں مانا ہے اور نہ ان کی بشریت کا کلمہ پڑھا ہے۔

ہم سے یہ مطالبہ کرنا کہ ہم دنیاوی مسائل میں بھی ان کی تقلید کریں قطعی غلط ہے۔ ایسا ہی ہوتا تو پروردگار عالم ہمیں عقل نہ دیتا اور ساری عقل ایک پیغمبر کے حوالے کر دیتا۔ عقل دینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم کچھ کام اپنی عقل سے کریں اور کچھ کاموں میں دین و عقیدے کے رشتے سے نبی یا

رسول پر اعتماد کریں۔

ارباپ کرم! یہ ہے آج کی دنیائے اسلام کا فلسفہ، اور یہ ہے وہ سعادت مند امت جو اپنے نبی کے اتباع سے جان بچانے کے لیے طرح طرح کے بہانے تلاش کر رہی ہے۔ مسلمان کا مقصد صرف یہ ہے کہ جہاں رسول اسلام کا اتباع اپنے مزاج پر گراں ہو اور اسلام کی تعلیم اپنی طبیعت کے خلاف ہو وہاں بشریت و رسالت کا جھگڑا اٹھا کر اپنی رائے پر عمل کر لیا جائے اور رسولِ عظیم کے فرمان کو ٹھکرا دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے صلح و جنگ کو شریعت سے نکال کر سیاست کے حصہ میں ڈال دیا ہے اور اسے رسول اکرم کی رائے کا تابع نہیں مانا۔ اس لیے کہ یہی جگہ وہ ہے جہاں جان کی بازی لگانا پڑتی ہے۔ مال غنیمت کے امکان کے باوجود تلوار نیام میں رکھنا پڑتی ہے۔ اور یہ باتیں ہر انسان کا مزاج نہیں برداشت کر سکتا۔

اسلامی قانون کا مطالعہ صاف بتا رہا ہے کہ صلح یا جنگ کا تعلق حکومت و اقتدار اور تخت و تاج سے نہیں ہے۔ صلح و جنگ اسلام کی حفاظت اور قانونِ الہی کی برتری کے تحفظ کے لیے ہوتی ہے اس کا ماتر تعلق شریعت و مذہب سے ہے۔ سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو صلح و جنگ کی ذمہ داری نماز اور روزہ سے بھی زیادہ ہے نماز، روزہ انسان کا ذاتی عمل ہے۔ اس کے بگڑ جانے سے انسان کے گنہگار ہو جانے کا اندیشہ ہے لیکن صلح و جنگ کا تعلق کسی انسان کے ذاتی اور انفرادی عمل سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا براہ راست ربط مذہب اور

اس کی حفاظت سے ہے۔ اس کے غلط ہو جانے میں بیجا خون بہانے اور اسلام کے سفاک و خونریز کہے جانے کا خطرہ ہے اور ظاہر ہے کہ انفرادی خطرہ اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا اہم وہ خطرہ ہوتا ہے جہاں مذہب پر آج آنے لگے۔ اور ناحق خون بہائے جانے لگیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ عرب اپنی پرانی فطرت اور جنگجو طبیعت سے مجبور تھے، انہوں نے کلمہ تو پڑھ لیا تھا۔ اسلام کے دامن میں پناہ تو لے لی تھی لیکن ان کے دل و دماغ میں صحیح طریقہ سے مذہب نہیں اتر اٹھا۔ ان کا منشا یہ تھا کہ اسلام لانے کے باوجود اپنے نفس کی تسکین کا سامان فراہم ہے اور جب مالِ غنیمت کی خواہش بیدار ہو میدانِ جنگ میں کود پڑیں، اور جہاں زندگی خطرے میں نظر آنے لگے صلح و مصالحت کی بات چیت شروع کر دیں۔

اسلام ایسے ہی مزاج کو بدلنا چاہتا تھا اور اس کا یہی مقصد تھا کہ میرے دائرے میں قدم رکھنے والے انسان عام انسانوں سے الگ ہو جائیں اور ان کے دل و دماغ ایک نئے سانچے میں ڈھال دیے جائیں۔ اسی لیے اس نے واضح لفظوں میں اعلان کر دیا کہ میرے رسول کی زندگی کو دو حصوں پر بانٹنا مجھ سے غداری ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ

میرا پیغمبر (محمد) صرف پیغمبر ہے۔ اس کا ہر عمل رسالت کا عمل ہے اور اس کی ہر ادا نبوت کی ادا ہے۔ وہ بولتا ہے تو وحیِ خدا سے بولتا ہے

ہاتھ اٹھاتا ہے تو اشارہ خداوندی کے بعد اٹھاتا ہے۔ حدیہ ہے کہ اس کی مشیت بھی مشیت الہی کی پابند ہے۔

” وَمَا تَشَاوَرْتِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ “

قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جہاں رسول کی زندگی کو دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہو اور اس میں نبوت و بشریت کا فرق قائم کیا گیا ہو۔ یہ صرف مسلمانوں کے ذہن کی پیداوار ہے جو ہر دور میں مختلف شکلوں میں سامنے آتی رہی ہے اور جس کا مقصد تو ہمیں رسالت کے سوا کچھ نہیں ہے حیرت تو یہ ہے کہ کل مسلمانوں نے قرآن کو کافی کہا تھا اور آج اسی قرآن سے روگردانی کی جا رہی ہے۔ گویا یہ ایک خاموش اقرار ہے کہ ہمیں جب بھی کسی نمائندہ الہی کی پیروی کا حکم دیا جاتا ہے تو ہم کسی نہ کسی بہانے سچ نکلتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے کہ اسلام اخلاص عمل کا نام ہے، عیار یوں اور مکار یوں کا نہیں۔ عیار و مکار سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن واقعی مسلمان نہیں ہو سکتا۔

مذہب و شریعت اور منصب الہی پر مکمل اعتماد کا نقشہ دیکھنا ہو تو کر بلا کے میدان میں آئیے جہاں ایک ایک بچہ منصب کی عظمت سے باخبر اور ایک ایک خاتون قانون الہی پر مکمل اعتماد رکھنے والی ہے۔ کیا دیتا اس حقیقت کو بھلا دے گی کہ ایک ماں یا ایک باپ کے دل میں اولاد کی کتنی محبت ہوتی ہے اور دنیا عزیزوں پر ہر دولت قربان کر سکتی ہے لیکن اولاد نہیں۔ یہ صرف کر بلا والے تھے جہاں ہر ماں اپنی اولاد کو قربان کرنے کے لیے بے چین تھی اور کسی ایک ذہن میں بھی یہ خیال نہیں آیا کہ جنگ کے معاصر

میں کسی کی پیروی فرض نہیں ہے وہاں ہر انسان کو اپنی رائے پر عمل کرنا چاہیے اور حتیٰ الامکان جان بچانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

خدا جانتا ہے اس حوصلے کے باپ اور اس حوصلے کی ماں کسی تاریخ میں نہیں ملتی جس حوصلے و بہمت کے ماں باپ کر بلا کے میدان میں نظر آتے ہیں۔ کوئی باپ اپنے بیٹے کو میدان میں بھیجے دے رہا ہے کوئی ماں اپنی اولاد کو خون میں ڈوبا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔

کوئی زوجہ راہِ خدا میں اپنا سہاگ اُجڑ جانے ہی سے خوش ہے کیا تاریخِ مسلم بن عوسجہ کی زوجہ کے کردار کو نظر انداز کر دے گی۔ وہ خاتون جو جذبہٴ خدمتِ دین میں شوہر کی ہمسر اور محبت میں سرشار تھی جس کی نگاہ میں عاشور کے دن اپنے گھر کا برباد ہو جانا ہی ضروری تھا جس کے حوصلہ کا یہ عالم تھا کہ غربت و مسافرت کے عالم میں شوہر کو مرنے کے لیے بھیج دیا اور اپنی تباہی کا ذرہ برابر خیال نہ کیا۔

شوہر بھی کیسا شوہر۔ زوجہ کے جذبات کا قدرواں حسین کا غلام عوسجہ کا لال اور صحیح معنوں میں مسلم، امام سے اذنِ جہاد لیکر میدان میں آئے۔ تاحدِ امرکان جنگ کی اور جب زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گرنے لگے تو امام کو آواز دی۔ مولا آئیے! غلام کی خبر لیجیے۔ آقا! چلے نہ والادنیاء سے رخصت ہو رہا ہے اب آجیے۔ فرزندِ رسول! جلدی تشریف لائیے۔ ایسا نہ ہو کہ غلام دم توڑ دے اور وقتِ آخر آپ کی زیارت بھی نہ ہو سکے۔

حسینؑ کے کانوں میں آواز آئی۔ تیری سے اٹھے۔ میدان کا رخ کیا۔ حبیب کو ساتھ لیا۔ دوڑتے ہوئے مسلم کے سر ہانے پہنچے۔ چاہنے والے کو نزع کے عالم میں دیکھا۔ کون جانے حسینؑ پر کیا گذر گئی عجب نہیں مولا کلیجہ بکپڑ کر بیٹھ گئے ہوں۔ مسلم اب تم بھی حسینؑ کا ساتھ چھوڑے دے رہے ہو۔؟ مسلم! میں اکیلے رہا جا رہا ہوں۔ مسلم! میرے چاہنے والے ایک ایک کر کے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

غلام نے آقا کے دردِ دل کا احساس کیا۔ مولا سے نظر چار کرتے تو کیونکر۔؟ حسرت سے حبیب کی طرف دیکھا۔ حبیب مقصد سمجھے۔ کہنے لگے مسلم! غالباً تم کوئی وصیت کرنا چاہتے ہو۔؟

مسلم نے حبیب کے چہرے پر نظر ڈالی۔ جذبات کا طوفان دیکھا اور دھیمی آواز سے کہا۔ حبیب! کیا وصیت کروں؟ اب تم بھی میرے ہی پاس آ رہے ہو۔ حبیب نے مسلم کے جذبات کا اندازہ کیا۔ سہارا دیتے ہوئے فرمایا۔ مسلم! یہ صحیح ہے کہ اب زندگی کا کوئی لطف نہیں ہے۔ یہ زندگی کس کام کی۔ کہ نبی زادہ نزعۃ اعداء میں گھرا ہے اور ہم لوگ زندہ رہیں۔ لیکن اے مسلم! یقین کرو۔ اگر تم کوئی وصیت کرو گے تو مرتے دم تک اس پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔

مسلم کا تڑپتا ہوا دل ٹھہرا۔ سانس رُکی۔ ایک مرتبہ حسرت و یاس سے مولا کے چہرہ پر نظر ڈالی اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز سے فرمایا۔ حبیب! اور کوئی وصیت نہیں ہے۔ زوجہ کے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے

کس ن بچے کا کوئی خیال نہیں ہے۔ بس صرف ایک تمنائے۔ دیکھو! جب تک زندہ رہنا مولا پر آنچ نہ آنے دینا۔ حبیب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مولا، غلام کا جذبہ ولاد دیکھ کر رو دیے۔ اللہ! ایسے با وفا ساتھی کسے ملیں گے۔ یہ میرا وفادار ہے جو وقتِ آخر بھی میری غربت و سیکسی پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

تاریخ بول سکتی تو بولتی۔ مورخ کے پہلو میں دل ہوتا تو جذبات کی ترجمانی کرتا۔ عقیدت کے سوا کون ہے جو حسین کی حالت بتا سکے اور محبت کے علاوہ کون ہے جو آقا کے حالات کی ترجمانی کر سکے۔

مولا کلیجہ تھامے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ حکمِ قضا نافذ ہوا مہلک الموت اپنے فرض سے سبکدوش ہوئے اور غلام دادِ وفادار دیکر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ غلام کا سر۔ آقا کا زانو۔ میں نہیں جانتا کہ حسین نے اپنے زانو سے مسلم کا سر کیسے ہٹایا ہوگا۔ اور مقتل میں غلام کو چھوڑ کر کیونکر واپس چلے ہوں گے، لیکن مقاتل سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جب فرزندِ رسول نے خیمہ کا رخ کیا تو ابھی چند قدم بھی نہ چلنے پائے تھے کہ خیمہ گاہ سے ایک کس ن بچہ کو نکلتا ہوا دیکھا۔ سر پر چھوٹا سا عمامہ، دوش پر تھمی سی زرہ، کمر سے تلوار لگائے ہوئے۔ کس ن کا یہ عالم کہ تلوار زمین پر خط دیتی جاتی ہے، تیزی سے میدان کی طرف دوڑتا ہوا جا رہا ہے۔

فرزندِ رسول نے دیکھتے ہی آواز دی۔ حبیب! یہ کس کا بچہ ہے، اور خیمہ گاہ سے نکل کر کدھر جا رہا ہے؟ ذرا اسے روکو۔ دیکھو تو میدان میں

تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔ اشقیاء ہر طرف آمادہ قتل کھڑے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس معصوم کا بچپن خاک میں مل جائے۔

حبیب نے بڑھ کے بچے کو روکا۔ بچے نے لاکھ کوشش کی، لیکن حبیب اسے لیکر خدمتِ امام میں حاضر ہوئے۔ امام نے فرطِ محبت سے بچے کو گلے سے لگالیا۔ چہرے سے یتیمی کے آثار نمایاں، تیورلوں پر تیل، دل میں نصرتِ امام کا جذبہ۔ فرمایا، میرے لال! تو کس کا فرزند ہے؟ اور کہاں جا رہا ہے؟ بیٹا، اس میدانِ بلا میں تیرا کیا کام ہے۔

عرض کی مولا! میں سلم بن عوسبہ کا فرزند ہوں۔ اب میدان میں آپ کے قدموں پر سزنا کر کے جا رہا ہوں۔ دیر سے میرے بابا کی خبر بھی نہیں آئی ہے۔ خدا جانے میرے باپ پر کیا گذر گئی۔

امام علیؑ سلام نے فرمایا، میرے لال! پلٹ جا۔ ایسا نہ ہو کہ تیرا گھر سے نکلنا تیری ماں کے دل پر شاق ہو؟

یہ سنا تھا، بچے نے دستِ ادب جوڑ کر عرض کیا، مولا! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آقا! یہ تلوار کمر سے کس نے لگائی ہے۔ یہ عمامہ سر پر کس نے باندھا ہے۔ یہ زرہ مجھے کس نے پہنائی ہے؟

امام علیؑ سلام کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اللہ! یہ میری غربت و بیکسی کہ اب عورتیں اپنی گود کے پالوں کو یوں سجا کر میدان میں بھیج رہی ہیں۔ آنسوؤں کو روک کر فرمایا، بیٹا جاؤ، واپس جاؤ۔ میرے لال میں تیرے باپ کے سر ہانے سے واپس آ رہا ہوں۔ بیٹا! تیرا باپ راہِ خدا میں

کام آگیا۔ تیری ماں کے لیے یہی غم کیا کم ہے۔ اب اسے اپنا غم نہ دے۔  
 کمسن بچے نے مولا کی گفتگو سن کر کلیہ بکڑ لیا۔ ایک طرف تیمی کا غم۔  
 دوسری طرف اِذنِ جہاد نہ ملنے کا صدمہ۔ اللہ! کیا میرا مقدر ایسا ہی  
 ہے کہ نہ سر پر باپ کا سایہ رہ گیا، نہ مولا کی طرف سے یہ اجازت ملی کہ اپنا  
 سر کٹا کر راہِ خدا میں سر بلند ہوں اور اسی ماں کا دل خوش کروں۔

بچہ اسی کشمکش میں تھا۔ زبان پر الفاظ نہیں آ رہے تھے کہ اپنے  
 دردِ دل کا اظہار کرے۔ آنے والی سانس بھی رُک رُک کر آرہی تھی ہر منزل  
 پر احساسِ تنہائی اور حسرتِ جہادِ دل توڑے دے رہی تھی کہ ایک مرتبہ مقدر نے  
 یاوری کی اور لپسِ پردہ سے ایک نخیف آواز آئی۔

مولا! ایک بیوہ کا ہدیہ ہے رو نہ کیجیے گا، آقا! اسے اپنے  
 اصغر کا فدیہ سمجھیے۔ آقا! یہ میری آخری تمنائے، اسے پامال نہ ہونے  
 دیجیے۔ اے فاطمہ کے لال! اس کینز کی محنت سوارت ہو جانے دیجیے۔  
 میں اپنی آنکھوں سے اپنے لال کو خون میں نہایا ہوا دیکھ لوں۔

مولانا نے دل کو سنبھالا۔ آنسوؤں کے سیلاب کو روکا۔ بچہ کو اجازت  
 دی، خدا جانتا ہے کہ حسین نے کس دل سے اجازت دی ہوگی اور مولا کے  
 دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ میدان میں مسلم کا لال لپسِ پردہ مسلم کی بیوہ۔ ماں  
 بیٹے کی آخری خبر کا انتظار کر رہی ہے۔

ایک مرتبہ کیسی نے آواز دی۔ بیوہ مسلم! تیری گودا جڑ گئی۔ تیری  
 آرزو پوری ہو گئی۔ تیری گود کا پالا میدان میں کام آگیا۔ مولا تیرے لال کی

میتے کر رہے ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ زوجہ مسلم نے آنسو بہائے یا شکر کا سجدہ کیا۔  
ہاں فضا میں یہ تاثیر ضرور رہ گئی کہ آج ہماری ماں بہنیں سر پیٹ پیٹ  
کر مسلم کے لال کا ماتم کر رہی ہیں، اور سہول آواز دے رہا ہے کاش ہم  
بھی کر بلا کے میدان میں ہوتے تو اپنی گود کے پالوں کو زہرا کے لال پر قربان  
کر دیتے۔

” اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ • “

۶

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ  
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى  
 سَيِّدِنَا الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا أَبِي الْقَاسِمِ  
 مُحَمَّدٍ وَإِلَيْهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ وَالْعَنَّةُ الدَّائِمَةُ  
 عَلَى أَعْدَائِهِمْ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ • أَمَا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ  
 اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ •  
 ” وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ “ •

ارشاد رب العزت ہوتا ہے۔ یہ محمد صرف میرا رسول ہے۔ اسے  
 پہچانتا ہے تو صرف رسالت کے ذریعہ پہچانوں۔ رسالت سے ہٹ کر اس کی  
 زندگی میں کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو اس کا مکمل تعارف کر سکے اور اس کی  
 بلند ترین سہستی کی نشاندہی کر سکے، یہ رسالت ہی ہے جس نے اس کے جملہ کمالات  
 کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے اور اتنی عظمت پیدا کر لی ہے کہ مالک کائنات

نے اپنے حبیب کے تعارف میں اس کے علاوہ کسی صفت کا ذکر نہیں کیا۔  
 مالک کائنات کے جتنے نمائندے اس کائنات کی ہدایت اور اس  
 دنیا کے انسانیت کو صراطِ مستقیم پر لگانے کے لیے آئے انھیں رب العزت  
 نے مختلف القاب اور خطابات سے یاد کیا ہے کسی کو خلیفہ کہہ کے یاد  
 کیا ہے کسی کو لفظ نبی سے تعبیر کیا ہے۔ کسی کو رسول کہہ کے پکارا ہے  
 کسی کو امام بنایا ہے کسی کو ولی اور اولی الامر کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔  
 ہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ الفاظ مختلف مواقع پر الگ الگ شخصیتوں کے  
 لیے استعمال ہوئے ہیں یا ایک ہی شخصیت کے لیے مختلف حالات اور  
 مواقع کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں۔ تو ان کے درمیان کوئی نہ کوئی  
 فرق ضرور ہوگا۔ اور ان کے معانی میں ایسی نزاکتیں ہوں گی جن کی بنا پر  
 رسول کے موقع پر نبی نہیں کہا گیا اور نبی کے موقع پر لفظ امام سے یاد نہیں  
 کیا گیا۔

ضرورت ہے کہ ہم قرآن حکیم اور بیانِ رسول کی روشنی میں تلاش  
 کریں کہ آخر ان الفاظ کا منشاء کیا ہے اور انھیں حالات و مقامات کے  
 اعتبار سے الگ الگ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔

مذہب کی زبان میں تحقیق کرنے سے پہلے ایک نظر عرب کی زبان پر ڈالنا  
 ہوگی، جہاں سے یہ الفاظ قرآن کریم یا بیانِ رسول میں داخل ہوئے ہیں۔

اس لیے کہ عربی زبان بنیادی طور پر عرب ہی کی زبان ہے۔ خالق کائنات  
 یا قرآن کریم کی ایجاد کی ہوئی نہیں ہے۔ قرآن مجید تو عربوں کی زبان میں نازل ہوا

جیسا کہ اس نے خود اعلان کیا۔ ” اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا “  
ہم نے یہ قرآن عربی انداز میں نازل کیا ہے۔

ایسے حالات میں قرآن حکیم کے معانی و مطالب سمجھنے کے لیے عربی زبان کا سہارا لینا بچی ضروری ہے۔ زبان ہمیشہ اہل زبان ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ محاورات کی خصوصیت زبان والے ہی پہچانا کرتے ہیں غیر زبان والا کسی زبان کے محاورات کا فیصلہ نہیں کر سکتا اور نہ اسے دوسری زبان کے معاملات میں دخل دینے کا حق ہے۔

زبان کا مسئلہ قوم و ملت کے مزاج طرز زندگی اور افتادِ طبع سے متعلق ہوتا ہے۔ اسے عقل و منطق سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ اس کے مسائل فلسفہ کے اصول سے حل کر لیے جائیں۔ اہل زبان نے ایک لفظ کے لیے ایک معنی قرار دیدیے ہیں تو صبحِ قیامت وہی معنی رہیں گے چاہے دنیا کے تمام اہل عقل کو اس سے اختلافات ہو اور وہ اس معنی کو پسند نہ کریں۔ یہ ممکن ہے کہ اہل عقل اسی لفظ کو دوبارہ کسی اور معنی کے لیے بنائیں۔ لیکن یہ ان کی ذاتی اصطلاح ہوگی۔ اس سے زبان کے اصلی معنی پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔

زبان کا مسئلہ انسانی زندگی میں بالعموم اور آج کی دنیا میں بالخصوص ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ انسانیت کے ماہرین مسلسل تحقیق میں مصروف ہیں۔ ملکوں میں اس مسئلہ پر فسادات ہو رہے ہیں۔ دنیا نے انسانیت کا خون ارزاں ہو رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا ترقی کی اس منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں زبان کے مسائل اسلحوں سے حل کیے جائیں گے اور لفظوں کے

استعمال کے لیے سینوں کا استعمال کیا جائے گا۔ حیرت ہے کہ یہ دنیا کہہ جا رہی ہے اور اس کی عقل پر کتنے پردے پڑے جا رہے ہیں۔ مجھے تو ایسا نظر آ رہا ہے کہ اس دور کی زندگی میں پردے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ عقلوں پر جہالت کا پردہ، خیالات پر سیاست کا پردہ، شخصیت پر مکاری کا پردہ، جہالت پر علم کا پردہ، کمزوری پر تکبر و غرور کا پردہ، چلتی پھرتی میتوں پر زندگی کا پردہ اور اتنے شدید پردوں کے بعد کبھی نہیں ہے تو عورتوں کا پردہ، اور شاید یہ سب نتیجہ ہے اسی ایک پردہ کے نہ ہونے کا۔ کہ انسانی زندگی روز بروز پردوں میں چلی جا رہی ہے اور کوئی حقیقت کھل کر سامنے نہیں آ رہی ہے۔

چھوڑیے فی الحال ان بحثوں میں نہیں الجھنا ہے۔ اس وقت تو قرآن کریم کے الفاظ کے معانی طے کرنا ہے اور اس کے لیے عربی لغت کا سہارا لینا ہے۔ قرآن حکیم کی یہ عظیم احتیاط تھی کہ اس نے زبان کے معاملات میں عرب کے جذبات کی قدر کی ہے اور ان کے الفاظ کو جدید معانی نہیں پہنائے ورنہ عرب کی متعصب دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا اور کوئی قرآن حکیم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا۔ یہ احتیاط اس منزل تک پہنچی کہ قرآن حکیم نے اپنے کو انھیں کی زبان کا معجزہ بنا دیا اور انھیں واضح لفظوں میں یہ باور کرا دیا کہ یہ بات تمہارے لیے باعثِ فخر ہے کہ تمہاری زبان میں ایک ایسا بلند کلام بھی پایا جاتا ہے جس کا جواب پوری دنیا کے انسانیت کے پاس نہیں ہے۔ عرب نے اس نکتہ کو پہچانا یا نہیں۔ تاریخ اس سلسلے میں واضح

بیان دیتے سے قاصر ہے لیکن آج عرب ممالک کے بیانات کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اب دنیا کی آنکھیں کھل رہی ہیں اور عرب اسی ایک بات پر نازاں نظر آ رہا ہے ہیں کہ قرآن ہماری زبان میں نازل ہوا ہے اور ہماری زبان میں ایک ایسا بھی کلام ہے جس کا جواب کسی زبان والے کے پاس نہیں ہے۔ قرآن حکیم کے لیے ایک دشواری ضرور تھی۔ کہ عرب نے اپنے الفاظ کے جو معانی تلاش کیے تھے اور جن مطالب کو ادا کرنے کے لیے الفاظ تراشے تھے وہ سب محسوس اور مادی تھے۔ عالم احساس سے ماوراء اور ارواح و عقول کی منزل تک ان کے دماغوں کی رسائی نہ تھی۔ توحید و قیامت جیسے غیر محسوس مسائل ان کی زندگی میں داخل نہ ہوئے تھے، اور انھیں ان کا تصور بھی نہ تھا۔ اور قرآن حکیم کو ایسے ہی افکار و عقائد کو دینا کے حوالے کرنا تھا۔

ظاہر ہے کہ عربی کے الفاظ استعمال کرنے کا ایک عظیم نقصان یہ تھا کہ اس طرح لوگ الفاظ کے وہی معنی سمجھتے جو ان کی زبان میں رائج تھے۔ وہ لفظ ”اِسْتَوٰی“ سے وہی نشست کا اندازہ سمجھتے جو ان کے سماج میں رائج تھا۔ ”یَدُ اللّٰهِ“ سے وہی ہاتھ مراد لیتے جو ان کے بدن کا ایک جُز تھا۔ ”کُرْسِی“ سے وہی کُرسی مراد لیتے جسے اپنے گھروں میں دیکھا تھا۔ ”قَلْب“ سے وہی گوشت کا ٹکڑا مراد لیتے جسے اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے تھے اور قرآن حکیم کو اس سے بالاتر مفاہیم و خیالات کی نشاندہی کرنا تھی۔ سخت منزل تھی اور عیبیہ مرحلہ تھا۔ زبان کے معانی تھی نہ بدلنے پائیں اور

محسوس مزاج والوں کو معقولات تک پہنچا دیا جائے۔ مشاہدہ کے قیدلوں کو اسرارِ غیب سے آشنا بنا دیا جائے۔

یہ قرآن حکیم کے متکلم کا کمال تھا کہ اس نے ایک لفظ سے سارے مسائل کو حل کر دیا اور ایک نکتہ کو ایجاد کر کے ساری دشواریوں کو آسان بنا دیا۔ اور وہ ہے لفظ ”تاویل“۔ اس نے آواز دی اس قرآن میں الفاظ کے معانی بھی ہیں اور تاویل بھی، اسے سمجھنے کے لیے اہل زبان کے بیانات سے بھی مدد لینا پڑے گی اور ہمارے افکار و نظریات سے بھی۔ تم نے صرف ان کے بیانات پر اعتماد کر لیا تو محسوسات میں گم ہو جاؤ گے اور عقائد کی بلند ترین منزلوں تک نہ پہنچ سکو گے اور صرف عقیدہ کو لے لیا تو اس کی تشریح کے لیے ہمارے بیان تک نہ پہنچ سکو گے۔ ضرورت ہے کہ عرب کے معانی کو ہمارے افکار کی روشنی میں سمجھو اور یہ اندازہ کرو کہ محسوسات کو معقولات کے سانچے میں کیونکر ڈھالا جاتا ہے۔ مشاہدات کو دیکھ کر غیب تک رسائی کیونکر ہوتی ہے۔ اب اسلامی عقائد کو سمجھنا ہے تو ”کڑی سی“ کو نہ دیکھو! اس کے غلبہ و احاطہ کو دیکھو۔ ہاتھ کو نہ دیکھو، اُس کی قوت اور طاقت کو دیکھو۔ قلب کو نہ دیکھو، اس کے افکار و خیالات کو دیکھو، اپنا اندازِ تشست نہ دیکھو، سلطانی قہر اور جبروتی اقتدار کو دیکھو۔

قرآن کریم کا یہ وہ سلیقہٴ افہام و تفہیم تھا جسے حقیقی معنوں میں اس کا معجزہ کہا جاسکتا ہے۔ اس نے اس اندازِ بیان کو اختیار کر کے کئی فائدے حاصل کیے ہیں۔

ایک طرف عرب کے جذبات کی حمایت کی اور زبان کے معانی میں دخل اندازی نہیں کی اور اس طرح بغاوت کے عظیم طوفان کو روک دیا اور سیلاب پر پہلی ہی منزل میں بندھ بانڈھ دیا۔ دوسری طرف انھیں الفاظ کا سہارا لیکر دنیا سے عربیت کو اپنے عظیم اور وسیع ترین خیالات سے روشناس کر دیا۔

اور ان سب سے بالاتر اہل ہوا و ہوس کے دماغوں پر پہرے بٹھادیے اور انھیں حقائقِ قرآن میں دخل اندازی کرنے سے مکمل طور پر روک دیا۔ یاد رکھو! اگر یہ قرآن صرف محسوسات اور مشاہدات کی دنیا سے متعلق ہوتا تو ہر صاحبِ زبان الفاظ کے معانی کو دیکھ کر اس کی حقیقتوں تک پہنچ جاتا، لیکن اسے کیا کرو گے کہ اس میں معقولات اور غائبات کا بھی ایک سلسلہ ہے جسے انھیں الفاظ کے پردہ میں چھپا دیا گیا ہے اس کا اندازہ نہ الفاظ سے ہو گا نہ معانی سے۔ نہ زبان سے ہو گا نہ لغت سے۔ اس کا علم تو اسی پردہ ڈالنے والے کو ہو گا جس نے اس سلسلے کو پردہ میں چھپایا ہے۔ اسی عالم الغیب کو ہو گا جسے غیبی اسرار کی مکمل اطلاع ہے اور جس کے علم سے کائنات کا کوئی ذرہ باہر نہیں۔ اسی لیے اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا:

وَمَا يَعْزِمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ

قرآن کے الفاظ کے معانی تو ہر عرب جانتا ہے اور اسی لیے اسے کلامِ بشر سے بالاتر اور معجزہ تسلیم کرتا ہے لیکن اسکی تاویل، اس کی حقیقت

اور اس کے معقولات و غائبیات کو یا خدا جانتا ہے یا وہ لوگ جو علم میں رسوخ رکھتے ہیں اور جنہیں مالکِ قرآن نے علمِ قرآن عطا کیا ہے۔

اب پہچانا آپ نے۔ کہ قرآن اور اہلبیت کا رشتہ کیا ہے، اور پیغمبر اکرمؐ دنیا سے جاتے جاتے قرآن کے ساتھ اہلبیت کو کیوں چھوڑ گئے تھے۔ یہ ایک اشارہ ہے کہ اُمتِ تاویلِ قرآن۔ حقیقتِ قرآن۔ مقصدِ قرآن اور روحِ قرآن کا علم حاصل کرنا چاہے تو اسے اہلبیتؑ کی ڈیوڑھی پر آنا پڑے گا۔ ” (حدیث ہے :)

” فَمَنْ أَرَادَ الْعِلْمَ فَلْيَأْتِ الْبَابَ “

” جسے بھی علم حاصل کرنا ہو وہ بابِ مدینہٴ علم تک آئے “  
جیسے بھی حکمتِ درکار ہو وہ علیؑ کی چوکھٹ پر جس میں سائی کرے۔ قرآن ملے گا تو یہیں۔ اسلام ملے گا تو یہیں۔ دین ملے گا تو یہیں۔ احکام ملیں گے تو یہیں۔ نبوت ملے گی تو اسی گھر میں۔ اور توحید کا سبق ملے گا تو اسی در سے۔

میں یہ گزارش کر رہا تھا، الفاظِ قرآن کو سمجھنے کے لیے لغتِ عرب اور مزاجِ اسلام دونوں کا سمجھنا ضروری ہے۔ تنہا کسی ایک کے علم سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ آئیے اسی روشنی میں ان الفاظ کے مفہوم پر غور کیا جائے۔ عربی زبان کے اعتبار سے نبی کے معنی ہیں، خبر دینے والا۔ رسول کے معنی ہیں پیغام پہنچانے والا۔ خلیفہ کے معنی ہیں کسی کی جگہ پر آنے والا۔ اور امام کے معنی ہیں کسی کے آگے چلنے والا۔

ظاہر ہے کہ محسوسات کی دنیا میں خبر۔ پیغام جبکہ اور سامنے یا پیچھے کا ایک عام مفہوم ہے جس کا تعلق صرف مادیات سے ہے اور مزہب کے خیالات اس سے کہیں زیادہ بلند ہیں۔ یہاں خبر یا پیغام دنیا کے عام پیغام جیسا نہیں ہے۔ جبکہ کا تصور عام مکانات کا نہیں ہے بلکہ یہ عظیم عہدے ہیں جن کی ایک معنویت ہے اور معنوی دنیا میں قدر و قیمت ہے۔

خبر دینا اور پیغام پہنچانا ناظر ایک ہی ہے لیکن اگر آپ غور کریں گے تو دونوں میں ایک نازک سافرق معلوم ہوگا۔ خبر دینے والے کی وہ ذمہ داری نہیں ہوتی جو پیغام پہنچانے والے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ خبر دینے والے کی ذمہ داری خبر سنا دینے کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور جسے پیغام دے کر بھیجا جاتا ہے اُس سے یہ اُمید ہوتی ہے کہ وہ اس پیغام پر عمل بھی کرے گا۔ اسی لیے شریعتِ اسلام نے نبی اور رسول کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ جس کا سندہ الہی پر تبلیغ کی ذمہ داری نہیں ہوتی اُسے نبی کہتے ہیں اور جس پر تبلیغ کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے اُسے رسول کہتے ہیں۔ خدا نے نبی ایک لاکھ چوبیس ہزار بھیجے ہیں لیکن رسول صرف تین سو تیرہ ہی بنائے ہیں۔ انبیاء اپنے عمل یا اپنے قول سے مرضی خدا اور منشاء الہی کی خبر دیا کرتے تھے اور مرسلین، امت کو عمل پر آمادہ کیا کرتے تھے انبیاء کے پاس تبلیغی نظام کا ہونا ضروری نہیں تھا لیکن مرسلین اپنے ساتھ پورا نظام لے کر آیا کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک منزل ان

دونوں سے بھی بالاتر ہے جسے صاحبِ عزم کہا جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری صرف تبلیغ کی نہیں ہے، بلکہ بدلے ہوئے حالات میں نئی شریعت اور نئے وقتوں کو رواج دینا بھی ہے۔

ظاہر ہے کہ دوسرے کے پیغام پر عمل کی دعوت دینا اتنا مشکل کام نہیں ہے جتنا ایک نئے پیغام کو پیش کر دینا یا رائج کر دینا۔ اس مندر پر ہزاروں شبہات کا سامنا ہوتا ہے۔ سیکڑوں بغاوتیں سر اٹھاتی ہیں اور ہر انسان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب کل کی شریعت بھی خدا ہی کی شریعت تھی تو آج اسے بدلائیں گے، اور اس میں انقلاب کیوں لایا گیا تفصیل کا وقت نہیں ہے ورنہ میں نے نظام کے رائج کرنے کی دشواریاں اور عوام کے جذباتِ بغاوت کا تجزیہ کر کے بتاتا کہ یہ کام کتنا بڑا حوصلہ اور کتنا پختہ عزم چاہتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جن کے حوالے اتنا اہم کام کیا گیا تھا انھیں رب العالمین نے اولوالعزم کہہ کے یاد کیا ہے۔ یہ وہ باہمت افراد تھے جن کے عزم کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ حوصلہ مند شخصیتیں تھیں جن کے ارادوں کے سامنے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ عزمِ نوح گواہ ہے کہ پتھر میں دب جانا ممکن ہے، تبلیغ کا چھوڑ دینا ممکن نہیں۔ عزمِ ابراہیم گواہ ہے کہ آگ میں کود پڑنا ممکن ہے توحید کا پیغام ترک کر دینا ممکن نہیں۔ عزمِ موسیٰ پکار رہا ہے کہ نیل کی موجوں سے کھیلنا آسان ہے دینِ خدا سے کھیلنا مشکل۔ عزمِ عیسیٰ اعلان کر رہا ہے کہ ”زعمِ باطل میں“ تختہ دار کا سامنا آسان ہے لیکن کارِ ہدایت کا

ترک کر دینا مشکل۔ اور عزم سرکارِ دو عالمؐ آواز دے رہا ہے کہ پتھر، آگ، پانی، سولی کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا انبیاءِ سابقین کا کام تھا اور یہاں تو حوصلوں کی وہ منزل ہے کہ اگر ایک ہاتھ پر آفتاب رکھ دیا جائے اور دوسرے ہاتھ پر مانتاب رکھ دیا جائے تو بھی ارادوں میں فرق نہیں آسکتا اور تبلیغ کے کاموں میں رکاوٹ نہیں پیدا ہو سکتی۔

مرسلِ اعظمؐ کا یہی حوصلہ اور حبیبِ خدا کا یہی مستحکم ارادہ تھا جس پر مالک کو بھی پیارا لگیا۔ اور اُس نے آواز دی ”اَحْسَنْتَ“ میرے حبیب۔ ”مرحبا“ میرے محبوب۔ اگر تو نے میرے مقصد کے لیے اتنی بڑی قربانی کا عزم کر لیا ہے تو میں بھی تجھ سے وعدہ کیے لیتا ہوں

”وَاللّٰهُ يَعْصِيكَ مِنَ النَّاسِ“

”تو دین کی تبلیغ کرتا جائے گا اور میں تیری حفاظت کرتا جاؤں گا۔“

یاد رکھیے! پیغامبری کی دشواریوں ہی سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس پیغام کا تحفظ کس قدر دشوار اور کس قدر مشکل ہے۔ اس لیے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مد مقابل پیغام کی عظمت یا اس کے ملنے والوں کے طاقت کو دیکھ کر وقتی طور پر چپ ہو جاتا ہے اور اس موقع کا انتظار کیا کرتا ہے جب یہ شیرازہ منتشر ہو جائے اور اسے دوبارہ پیغام کو مٹانے اور رسالت پر حملہ کرنے کا موقع مل جائے۔ اُحد کی لڑائی اس بات کی زندہ گواہ ہے کہ باطل کبھی چین سے نہیں بیٹھا کرتا۔ اس کے ذہن میں ہمیشہ حق کو پامال کرنے کی تدبیریں رہتی ہیں۔ اور وہ اپنے موقع کا منتظر رہتا ہے۔

یہ بات واضح ہو جائے تو ائمہ معصومین کی زحمّتوں کا بھی صحیح اندازہ ہوتا ہے جہاں باطل ایک مڑت تک خاموش بیٹھنے کے بعد پھر منظر عام پر آیا ہے اور ابوسفیان کی اولاد محمد عربی کے فرزند سے بیعت لینا چاہتی ہے۔ یاد رکھیے یہ یزید، حسین بن علی سے مطالبہ بیعت نہیں کر رہا ہے کفر، اسلام سے اپنا انتقام لے رہا ہے۔ باطل، حق سے اعلانِ جنگ کر رہا ہے۔ وقتی خاموشی شور طوفان سے بدل رہی ہے اور وقت آ گیا ہے کہ کوئی مردِ مجاہد اٹھ کر رسالت کی حفاظت کرے اور یزید پر واضح کر دے کہ تو نے محمد عربی کے عزم کو نہیں دیکھا۔ لے محمد کے نواسے کا عزم دیکھ لے۔ اگر دین کی حفاظت کے لیے مجھے سر بھی دینا پڑے گا تو سر دے دوں گا۔ لیکن عزتِ دین کو برباد نہیں ہونے دوں گا۔

دین و شریعت کے تحفظ کا یہی عزم تھا جس نے حسین بن علی کو ایک خاص طرز کے اصحاب کو جمع کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حسینؑ جانتے تھے کہ میں نانا کی طرح بیشمار اصحاب اور بابا کی طرح بکثرت انصار جمع کر سکتا ہوں۔ اہل دنیا میرے ساتھ بھی آنے کے لیے بیچیں ہیں لیکن آپ ہر قدم پر واضح کر دینا چاہتے تھے کہ اب دین کو اصحاب و انصار کی ضرورت نہیں ہے۔ اب لشکر و فوج کی منزلیں گزر چکی ہیں۔ اب سرکٹانے والے جاں نثار اور تلواروں کی دھاروں پر چلتے والے مجاہدین کی ضرورت ہے۔ اسی لیے آپ نے قدم قدم پر ساتھیوں کو آواز دی کہ جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ اس راہ میں مصائب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہاں سرکٹانے کا مرحلہ اور گھر لٹانے کی منزل ہے

خدا جانتا ہے کہ اس عزم کا سردار لشکر آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔  
 دنیا کے سردارانِ لشکر وقتِ آخر تک فوجوں کو کامیابی کا یقین دلاتے رہتے  
 ہیں اور اپنے والوں کو یہی سمجھاتے رہتے ہیں کہ آخری فتح ہماری ہے کامیابی  
 ہمارے ہی قدم چومے گی۔ تخت و تاج ہمارے ہی قدموں میں رہیں گے۔ لیکن  
 حسینؑ ہر قدم پر یہ واضح کرتے جاتے تھے کہ جانا ہے تو چلے جاؤ۔  
 یہاں نہ تخت ہے نہ تاج۔ نہ حکومت ہے نہ اقتدار۔ نہ مال  
 غنیمت ہے نہ آب و دانہ۔

خدا جانے وہ کیسے حوصلہ مند اور با وفا اصحاب تھے جو ایسے حالات  
 میں بھی امام حسینؑ علیہ السلام کے قدموں سے لپٹے رہے۔ اور ایک لمحہ کے  
 لیے فرزندِ رسولؐ کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ موت آتی ہے تو آجائے گلے کٹتے  
 ہیں تو کٹ جائیں گھر لٹتا ہے تو لٹ جائے لیکن فرزندِ رسولؐ کا ساتھ  
 نہیں چھوڑے گا۔ حیرت ان پر نہیں ہے جو حسینؑ کے ساتھ تھے اور ایسے حالات  
 میں رہ گئے حیرت ان کی وفا پر ہے جو اپنے گھر میں چین سے بیٹھے ہوئے تھے  
 اور ان حالات کی خبر سنتے ہی کربلا کے لیے روانہ ہو گئے۔

کیا تاریخ اس واقعہ کو بھلا دے گی کہ حبیب ابن مظاہر اپنی زوجہ  
 کے ساتھ بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ کتنا یرسکون ماحول تھا اور  
 کتنے اطمینانی حالات کہ ایک مرتبہ کسی نے دَقَّ الْبَابِ کیا۔ حبیب نے  
 گھبرا کر پوچھا: کون؟ آنے والے نے کہا: "أَنَا بَرِيدُ الْحُسَيْنِ" میں  
 حسینؑ کا قاصد ہوں۔ حسینؑ کا نام سنا، دسترخوان چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

ارے، میرے آقا کا نامہ بر آیا ہے۔ میرے شہزادے کا خط لایا ہے۔ میرے مولانے مجھے یاد کیا ہے۔ — دوڑ کر دروازہ پر آئے۔ دروازہ کھولا فرطِ حجت سے لفافہ کو لیکر چاک کیا۔ دیکھا لکھا ہوا ہے:

”یہ خط حسین بن علی کا ہے ایک مردِ فقیر حبیب بن مظاہر کے نام۔ اے حبیب! ہم دشمنوں میں گھر گئے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم ہماری مدد کو آؤ،“ خط پڑھا۔ دل تڑپ گیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اللہ! رسول کا نواسہ اور نرغہ اعدا میں۔ فاطمہ کالال اور دشمنوں میں۔ علی کالنورِ نظر اور عالمِ غربت و مسافرت میں۔ سر جھکائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے زوجہ نے چہرہ کی اداسی میں خط کا مضمون پڑھا اور گھبرا کر کہا۔ حبیب! مولانے کیا لکھا ہے؟

حبیب نے بھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔ فرزندِ رسول نرغہ اعدا میں گھر گیا ہے مجھے مدد کے لیے بلا لیا ہے۔

زوجہ نے تڑپ کر لوچھا پھر کیا ارادہ ہے۔ یہ حبیب نے کہا۔ سوچ رہا ہوں کہ ان مصائب میں جاؤں یا نہ جاؤں۔

زوجہ نے کہا۔ افسوس، رسول کالواسہ بلا رہا ہے اور تم سوچ رہے ہو۔

حبیب نے کہا۔ مومنہ! تیرا خیال بھی تو ہے کہ تجھے کس پر چھوڑ کے جاؤں گا۔

زوجہ نے ننھی پیٹ لیا۔ اللہ۔ تمہیں میرا خیال ہے اور فاطمہ زہرا کا خیال

انہیں ہے۔ حبیب نے زوجہ کو تسکین دی۔ مومنہ میرا جانا بے حد ضروری ہے۔

میں ضرور جاؤں گا۔ چاہتا تھا کہ اس راہ میں تیرے جذبات کا بھی اظہار ہو جائے۔

اچھا۔ اگر تیرا بھی یہی حوصلہ ہے تو جاتا ہوں۔ اب شاید پلٹ کر لانا نصیب نہ ہو۔ زوجہ نے کمالِ محبت سے رخصت کیا۔ جاؤ خدا کے حوالہ کیا۔ دیکھو! میرا خیال نہ کرنا۔ میں اپنا سہاگ لٹانے کے لیے تیار ہو گئی۔ بس کوشش کرنا کہ میرے مولا پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ زوجہ حبیب کے جذبات نے نہ جانے کیا کیا کہا، اور حبیب نہ جانے کیا کیا ارادے لیکر چلے۔ گھر سے نکل کر غلام کو بلایا۔ حالاتِ زمانہ کو دیکھ کر غلام سے کہا۔ تو میرے گھوڑے کو لیکر چل اور فلاں مقام پر میرا انتظار کرنا۔ میں باغات کی طرف سے ہوتا ہوا آ رہا ہوں۔

غلام گھوڑے کو لے کر چلا اور ایک مقام پر پکڑا ہو گیا۔ ادھر حبیب کے آنے میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ قریب پہنچنے کو کیا دیکھا کہ گھوڑے کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور غلام کہہ رہا ہے: اے اسپ با وفا! اگر میرا مالک نہ آیا تو میں تیری پشت پر سوار ہو کر فرزندِ رسول کی مدد کو جاؤں گا۔

حبیب نے کلیجہ پکڑ لیا۔ دل نے آواز دی۔ فاطمہ کے لال! اب آپ کے مصائب اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ غلام جان قربان کرنے کے لیے تیار ہیں اور جانِ آنسو بہا رہے ہیں۔ یہ کہہ کر قریب پہنچے، غلام کے ہاتھ سے لجامِ فرس کو لیا۔ گھوڑے پر سوار ہوئے۔ غلام کی طرف رخ کر کے آواز دی: جا میں نے تجھے راہِ خدا میں آزاد کیا۔ غلام نے قدم تھام لیے۔ آقا! یہ کیسا انصاف ہے؟ جب تک آپ کی خدمت کا معاملہ تھا، آپ نے مجھے ساتھ رکھا، اور اب جو فرزندِ رسول کی خدمت کا

موقع آیا تو مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ یہ بہرگز نہ ہو سکے گا۔ اور میں آپ کے ہمراہ چلوں گا۔

حبیب نے غلام کو ساتھ لیا اور تیزی کے ساتھ بڑھے، ایسا نہ ہو کہ پہنچنے میں تاخیر ہو جائے اور فرزندِ رسولؐ کی بارگاہ میں شرمندہ ہونا پڑے۔

منزل سے قریب پہنچے تو دل مطمئن ہو گیا کہ مولا کی بارگاہ قریب ہے اور میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

ادھر کوفہ کی جانب سے اڑتی ہوئی گرد کو دیکھتے ہی فرزندِ رسولؐ نے اصحاب کو حکم دیا: بڑھو! بڑھو! استقبال کرو۔ میرا بچپن کا جان نثار حبیب آیا ہے۔

اصحاب بڑھے۔ حبیب کا استقبال کیا۔ حبیب مولا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اب جو دیکھا تو کیا دیکھا کہ مولا زرعہ اعدا میں ہیں اور چاروں طرف خون کے پیاسے ہیں۔ بچے پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔

دل سنبھالا۔ قربانی پر تیار ہوئے۔ امام کے سکون کو دیکھ کر اصحاب میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ادھر خیمہ میں یہ خبر پہنچی کہ کوئی آیا ہے۔ ثانی زہرا نے فضہ سے کہا۔ فضہ! دیکھو کون آیا ہے؟

فضہ دوڑ کر خیمہ پر آئی اور پلٹ کر خبر سنائی۔ شہزادی! مبارک ہو! آپ کے مانجھے کا بچپن کا ساتھی حبیب آیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ زینب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ فضہ! جلدی جا اور جا کر حبیب سے

میرا سلام کہنا۔ کہنا حبیب! تم نے بڑا احسان کیا جو ایسے وقت میں میرے  
مانجئے کی مدد کو آگئے۔ فقیہ نے آکر شہزادی کا پیغام سنایا۔ حبیب  
تڑپ گئے۔ خاک پر بیٹھ گئے۔ منہ پر تلپانچے مارنا شروع کیے۔  
اللہ! اب وہ وقت آگیا ہے کہ: دخترِ زہرا غلام کو سلام کہلواری ہیں، اور  
اس کا احسان مان رہی ہیں۔

عزادارو! یہ حبیب تمھے جنھوں نے زینب کے سلام کی یہ قدر  
کی۔ اب ایک سلام آپ کے نام بھی ہے۔ پہچانا آپ نے کون سا  
سلام جب حسین رخصتِ آخر کے بعد چلنے لگے تو بیمار بیٹے سے فرمایا۔  
میرے لال! جب قیدِ شام سے چھٹ کر مدینے جانا تو ہمارے شیعوں سے  
ہمارا سلام کہہ دینا۔ اور کہنا، شیعو! جب ٹھنڈا پانی پینا تو میری  
پیاس کو یاد کر لینا اور جب کسی غریب و شہید کا ذکر آجائے تو مجھ پر آنسو بہانا  
واحینا۔ واحینا۔

رونے والو! آؤ ہم سب مل کر فرزندِ رسولؐ کو جوابِ سلام دیں اور عرض  
کریں۔ آدم کے وارث! تجھ پر سلام۔ نوح کے وارث تجھ پر سلام  
۔ ابراہیم و اسمعیل کے وارث تجھ پر سلام۔ موسیٰ  
اور عیسیٰ کے وارث تجھ پر سلام۔ محمد کے لال تجھ پر سلام  
۔ علی کے نورِ نظر تجھ پر سلام۔ فاطمہ کے پارہٴ دل تجھ  
پر سلام۔

سلام اُس سراطر پر چونوکِ نیزہ پر بلند کیا گیا۔ سلام اُس

جسمِ اقدس پر جو خاکِ کربلا پر پڑا رہا — سلام اُس گلوئے مبارک  
 پر جسے کند خنجر سے کاٹا گیا — سلام اُس سینہِ اطہر پر جس پر  
 شمر نے قدم رکھے — سلام اُس لاشِ مطہرہ پر جسے گھوڑوں کی ٹاپوں  
 سے پامال کیا گیا — سلام اُن لبہائے نازنین پر جو وقتِ آخر  
 بھی نجشِ اُمت کی دُعائیں کرتے رہے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ

---

(۷)

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ  
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى  
 أَشْرَفِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا إِلَى الْقَاسِمِ  
 مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ وَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى  
 أَعْدَائِهِمْ أَجْمَعِينَ آمَنَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ  
 الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ  
 ”وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ“

ارشاد جناب اقدس الہی ہے۔ ”محمد صرف اللہ کے رسول ہیں۔“  
 مالکِ کائنات نے اپنے حبیب کے تعارف میں دو لفظیں استعمال کی  
 ہیں۔ ایک محمدؐ اور ایک رسول۔ بظاہر تو یہ دو لفظیں ہیں لیکن اگر غور کیا  
 جائے تو یہ آئینہ کے دو رخ ہیں جن میں مرسلِ اعظم کی پوری زندگی کا مشاہدہ  
 کیا جاسکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مالکِ کائنات نے قبلِ خلقتِ آدمؑ عالمِ نبوت

سے سرفراز کرنے کے بعد اپنے حبیب کو اس دنیا میں بھیجا اور رسل اعظم نے جب بھی اس دنیا میں قدم رکھا، رسالت آپ کے ساتھ ساتھ تھی۔ بعثت پیغمبر رسالت کا اعلان ہے، رسالت کی عطا نہیں ہے۔ بعثت رسالت کی عطا کیوں نہیں ہے اور اعلان رسالت سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے؟ ان تفصیلات کا موقع نہیں ہے۔

اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ رسالت کے اس عظیم عہدہ پر فائز ہونے کے بعد بھی حضور سرور کائنات نے جب اس دنیا میں قدم رکھا تو بشر ہی کے بھیس میں آئے۔ آپ کے جسم اقدس پر بشریت ہی کا لباس زیبا معلوم ہوا۔ آپ کو دنیا میں انسانیت و آدمیت ہی کی ایک فرد بنا کر بھیجا گیا۔ جس کے بعد آپ کی زندگی میں دو پہلوؤں کا پیدا ہونا ضروری تھا آپ بشر بھی تھے اور رسول بھی۔ آدمی بھی تھے اور نبی بھی۔ انسان بھی تھے اور ناسئذہ رحمٰن بھی۔ آدمیت کے اعتبار سے سارے انبیاء کے بعد دنیا میں تشریف لائے اور نبوت کے اعتبار سے قبل آدم بھی نبی تھے۔ بشریت کے اعتبار سے اولادِ آدم میں شمار ہوتے تھے اور رسالت کے اعتبار سے کائنات کا ایک جز تھے۔ اور روحانی کمالات کے اعتبار سے پوری کائنات کی روح و جان۔ اور خلقت کون و مکان کی اصل و علت

”لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ“  
 (محمد اگر تم نہ ہوتے تو یہ کائنات نہ ہوتی)

میں نے اس کائنات میں جو کچھ پیدا کیا ہے سب تمہارے ہی صدقے میں

پیدا کیا ہے۔

یہ بشریت ہی تھی جو آپ کو اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے اور چلنے پھرنے پر آمادہ کرتی تھی۔ اور آپ دنیا کے دوسرے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ روٹی، کپڑا، مکان آپ کے بھی بنیادی ضروریات میں شامل تھے۔ اور آپ نے ظاہری زندگی اس سادہ انداز سے گزاری کہ کفار کو کہنے کا موقع مل گیا کہ — ”ہم اسے نبی نہیں مانتے گے جو بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے اور کھانا بھی کھاتا ہے۔“

وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ نبوت و رسالت کھانے پینے کی محتاج نہیں ہے لیکن انسانی زندگی کے لیے یہ چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور محمد جہاں رسول ہیں وہاں بشر بھی ہیں۔ انسان بھی ہیں اور اولادِ آدم میں بھی ہیں۔

اسی نکتہ کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن حکیم نے مرسلِ اعظم کی رسالت کا اعلان ان لفظوں میں کیا تھا:

”هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ“

”وہ خدا وہ ہے جس نے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا جو انہیں میں سے تھا۔“

غور کرنے کی بات ہے کہ پیغمبر، رسول بھی تھا، اور انہیں میں سے تھا۔ ظاہر ہے کہ مکہ والے سب رسول نہیں تھے کہ رسول انہیں میں سے ہوتا بلکہ اس کا کھلا ہوا مقصد یہ ہے کہ ہمارا حبیب رسول ہونے کے باوجود مکہ والوں ہی میں سے تھا۔ رسول ہونا اس کا روحانی کمال ہے اور مکی

ہونا اس کے جسم کا تقاضا ہے۔ جب جسم رکھتا ہے تو جسم کسی نہ کسی مکان میں رہے گا اور جب مکان مقرر ہو جائے گا تو وطن کا رشتہ خود بخود پیدا ہو جائے گا۔

اس حقیقت کے ماننے میں کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیے کہ نبی کی

زندگی میں دو پہلو ہیں؛ ایک بشریت اور ایک رسالت — ایک آدمیت

اور ایک خاتمیت — لیکن قابلِ توجہ بات صرف یہ ہے کہ ان دونوں

پہلوؤں کو کسی وقت بھی الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا ناممکن ہے کہ کھاتے

پیتے وقت بشر رہیں اور رسالت ختم ہو جائے — اور نزولِ وحی کے وقت

رسول رہیں اور بشریت تام ہو جائے — نہیں نہیں یہ زندگی کے ہر لمحہ

میں — حیاتِ مادی کے ہر موڑ پر بشر بھی ہیں اور رسول بھی — حدیہ

ہے کہ کسی کی تعظیم کو اٹھتے ہیں — کسی کو دوش پر جگہ دیتے ہیں — کسی

کے لیے ناقہ بن جاتے ہیں تب بھی رسول رہتے ہیں — اور معراج کی

منزلوں کو طے کرتے ہوئے ”قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَذْفَى“ کی

منزل تک پہنچ جاتے ہیں تو بھی بشر ہی رہتے ہیں۔

معراجِ جسمانی کا انکار کرنے والے مسلمان اسی غلط فہمی میں پڑ

رہ گئے کہ رسالت کی زندگی الگ ہوتی ہے؛ اور بشریت کی زندگی الگ

اور مالک کائنات نے مادی جسم کے ساتھ عرشِ اعظم پر بلا کر یہ واضح کر دیا کہ

ان کی زندگی میں نہ بشریت، رسالت سے الگ ہے نہ رسالت بشریت سے

مختصر یہ ہے کہ یہ ایک ایسا رسول ہے جس کی رسالت بشریت کے

سایچہ میں ڈھال دی گئی ہے۔ اور ایک ایسا بشر ہے جس کی بشریت کا خمیر

رسالت سے اٹھایا گیا ہے۔

بشریت اور رسالت کے دونوں پہلو اس بات کا تقاضا کر رہے تھے کہ مالکِ کائنات دونوں منزلوں میں اپنے حبیب کی عظمت کا اعلان کرے اور دنیا کو بتائے کہ یہ بشریت کے اعتبار سے کتنا پاکیزہ کردار ہے اور منصب کے لحاظ سے کتنا بلند مرتبہ۔

شاید یہی وجہ تھی کہ مالکِ کائنات نے اپنے حبیب کے تعارف میں دو لفظیں استعمال کیں۔ ایک محمدؐ اور ایک رسولؐ۔ محمدؐ یعنی قابلِ تعریف و توصیف۔ رسولؐ یعنی تبلیغِ دین و شریعت کا ذمہ دار۔ ایک ذاتی کردار کی طرف اشارہ ہے اور ایک منصبی فرائض کی طرف۔ گویا قدرت یہ بتانا چاہتی ہے کہ میرا حبیب بشری کردار کے اعتبار سے محمدؐ ہے۔ اور منصبی فرائض کے اعتبار سے رسولؐ۔ اب جتنا محمدؐ پر غور کرتے جاؤ گے اس کی ذاتی زندگی کے کمالات کھلتے جائیں گے۔ اور جتنا رسالت کو پہچانتے جاؤ گے اس کی معنوی بلندی نگاہوں کے سامنے آتی جائے گی۔

ضرورت ہے کہ ان دو لفظوں کی مکمل معنویت پر غور کیا جائے، تاکہ پیغمبرِ اسلام کی زندگی کا پورا خاکہ نکا ہوں کے سامنے آجائے۔ لفظ رسولؐ کے بارے میں پھر کبھی بحث کی جائے گی۔ آج صرف لفظ محمدؐ کی شرح مقصود ہے۔

یاد رکھیں لفظ محمدؐ عربی زبان کا لفظ ہے جو حمد سے بنایا گیا ہے۔ حمد کے معنی ہیں اختیاری کمالات پر تعریف کرنا۔ اسی حمد سے محمود

بھی نکلا ہے اور محمد بھی۔ محمود کے معنی ہیں جس کی تعریف کی جائے اور محمد کے معنی ہیں جس کی بہت زیادہ تعریف کی جائے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ مالک کائنات نے اپنا نام محمود رکھا ہے۔ اور اپنے حبیب کو محمد کہا ہے؟ بندہ کبھی اتنی تعریف کے لائق ہو ہی نہیں سکتا جتنا لائق تعریف موجود اور مالک ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اپنے کو لائق تعریف کہا ہے اور اسے بہت زیادہ لائق تعریف۔ اس کے نہ کمالات مالک کے برابر ہو سکتے ہیں اور نہ اختیارات۔ بندہ پھر بندہ ہے اور مالک پھر مالک۔ بندہ کے پاس جو کچھ ہے سب مالک ہی کا دیا ہوا ہے جہاں تک میں نے غور کیا ہے ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ حمد خدا کی بھی ہوتی ہے اور محمد مصطفیٰ کی بھی۔ لیکن دونوں کی تعریف میں ایک نمایاں فرق ہے اور وہ یہ کہ خدا کی حمد بھی حمد ہوتی ہے سب میں قابل حمد خدا ہے اور حمد کرنے والے بندے اور محمد عربی کی جو تعریف ہوتی ہے اس میں قابل تعریف بندہ ہے اور تعریف کرنے والا خدا۔ گویا مالک اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ دیکھو تعریف میری بھی ہوتی ہے اور اس کی بھی، لیکن فرق یہ ہے کہ میری تعریف کرنے والے بندے ہیں اور اس کی تعریف کرنے والا میں ہوں۔ اور یہی فرق ہے کہ جس کی تعریف بندے کرتے ہیں وہ محمود ہوتا ہے اور جس کی تعریف خدا کرتا ہے وہ محمد ہوتا ہے۔

پہچانا آپ نے کہ اس نام محمد میں کیا کمالات ہیں۔ یہ نام نہیں ہے مالک کی طرف سے بے حد و اتہا قابل تعریف ہونے کی سند ہے

یہ نام نہیں ہے اس بات کا اعلان ہے کہ اس بندہ کی تعریف میں خود مالک بھی ”رطب اللسان“ ہے۔

ظاہر ہے کہ جسے خدا قابلِ حمد و ثنائیت کا اُس کی زندگی کیسی ہوگی اور اس کا کردار کیا ہوگا۔ بلکہ مجھے تو اہل عربیت سے پوچھنا، کہ حمد کا استعمال ”اختیاری کمالات کی تعریف“ کے بارے میں ہوتا ہے اور کائنات کا اختیار صرف مالک کے ہاتھ میں ہے اور اسی لیے سب کیلئے مدح کا استعمال ہوتا ہے اور خدا کے لیے حمد کا۔ تو خود خدا نے بندہ کے لیے اس لفظ کا استعمال کیوں کیا۔؟ کیا اسے زبان کی ان نزاکتوں کے اطّلاع نہیں ہے۔ کیا معاذ اللہ وہ عربی زبان کے خصوصیات سے باخبر نہیں ہے؟۔ اہل ادب جواب دیں گے، نہیں۔ اس نے ان تمام نکات کو پیش نظر رکھتے کے بعد اپنے حبیب کو نام محمدؐ سے نوازا ہے تو اب مجھے کہنے دیجیے کہ یہ نام صرف کردار کی پاکیزگی کا اعلان نہیں ہے بلکہ اس بات کا بھی اعلان ہے کہ میں نے کل کائنات کا اختیار بھی اپنے حبیبؐ کو دے دیا ہے۔ صاحب اختیار نہ بنایا ہوتا تو اسے مدوح کہتا۔ محمدؐ نہ کہتا۔ محمدؐ اسی لیے کہا ہے کہ تم ایک لفظ سے اس کے کردار کا بھی اندازہ کر لو اور اس کے اختیارات کی حدود کا بھی پتہ لگا لو۔ یہ بندوں کی اس منزل پر ہے جہاں نہ کردار کی عظمت سمجھ میں آتی ہے اور نہ اختیارات کی وسعت۔ پاکیزگی، کردار کا یہ عالم ہے کہ خدا سے لیکر دشمن تک سب تعریف کرتے ہیں اور وسعتِ اختیار کی یہ کیفیت ہے کہ ذراتِ زمین سے

نے کر عرشِ اعظم تک سب اس کے زیرِ قدم رہتے ہیں۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد میں اہل اسلام سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں اور مجھے ان کی غیرتِ اسلامی کو چیلنج کرنا ہے۔ مسلمانو! تم نے تو اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر صبح و شام اقرار کیا:

”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ (ساری حمد اللہ کے لیے ہے) یہ تم نے کسی بندہ کو لائقِ حمد اور محمد کیسے مان لیا۔ کیا الحمد للہ کہتے وقت حمد کا کچھ حصہ بجا لیا تھا جسے نبوت کی منزل میں صرف کر دیا۔ یا تمہارے کردار کا یہی انداز ہے کہ خدا کے سامنے جاؤ تو کہو، ”الْحَمْدُ لِلَّهِ“ ساری تعریف تیرے لیے ہے۔“ اور بندے کے سامنے جاؤ تو کہو: ”مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ“، یعنی میرے سرکار آپ بھی محمد اور مستحقِ حمد ہیں۔

خدا جانتا ہے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر غور و فکر کرنا دنیائے اسلام کا ایک فرض ہے۔ اور الحمد للہ کہلوانے والے خدا نے اپنے بندہ کا نام محمد اسی لیے رکھ دیا ہے کہ امتِ اسلامیہ اس مسئلہ پر غور کرے اور سوچے کہ ان دونوں کا اجتماع کیونکر ہوگا اور دونوں نظریات ایک نقطہ پر کس طرح جمع ہوں گے۔

یاد رکھئے کہ اگر مرسِلِ اعظم کو محمد خود خدا نے نہ کہہ دیا ہوتا تو اس نام سے یاد کرنا ایک طرح کا شرک ہو جاتا، اور کوئی مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان نہ رہ جاتا۔ یہ مالک کا رحم و کرم تھا کہ اس نے خود ہی اپنے بندہ

کا نام محمد رکھ دیا اور اس طرح ذہنوں کو ایک راستہ مل گیا اور مسئلہ کا ایک مستقل حل نکل آیا۔

مالکِ کائنات یہ بتانا چاہتا ہے کہ میرے بندے تیرا فرض ہے کہ تو الحمد للہ کہہ کر ساری حمد و ثناء میرے حوالے کر دے۔ تجھے اپنے پاس کچھ رکھنے کا حق نہیں ہے۔ اس کے بعد تجھے اختیار ہے کہ میں جسے چاہوں گا حوالے کر دوں گا۔ اور جب تو نے ساری حمد کی میسری ملکیت ہونے کا اقرار کر لیا تو اب تجھے یہ بتاتا ہوں کہ میں نے یہ حمد اپنے بندہ محمدؐ کے حوالے کر دی ہے۔ تو نے میسری حمد کی تو کہا الحمد للہ۔ میں نے اسے حمد دیدی تو کہا:

”وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ“

اب اس فلسفہ کو یاد رکھنا۔ کہ الحمد للہ کے بعد تمہیں کسی کو لائقِ حمد و ثناء بنانے کا حق نہیں ہے اور یہ حق صرف مالکِ کائنات کا ہے وہ جسے چاہے قابلِ تعریف بنا دے۔ بندہ کا فرض صرف یہ ہے کہ وہ جس کی تعریف کر دے اس کی تعریف کرتا رہے اور جسے بُرا کہہ دے اُسے بُرا کہتا رہے۔ اپنے پاس سے کسی فیصد کا اختیار نہیں ہے۔ وہ کسی کو نبی کہے تو نبی کہو۔ ولی کہے تو ولی کہو۔ امام و خلیفہ کہے تو امام و خلیفہ کہو۔ اور لعنت و برأت کا مستحق قرار دے تو اس کا بھی اظہار کرو۔

مرسلِ اعظمؐ کے اسمِ گرامی کے بارے میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے

کہ یہ نام مالکِ کائنات کا عطا کیا ہوا ہے اور اسی نے اپنے حبیب کو اس عظیم لقب سے سرفراز فرمایا ہے۔ اور نام جب کسی علم انسان کی طرف سے ہوتا ہے تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔ بہت سے بہت ایک فالِ نیک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اچھا نام یہ سمجھ کر رکھا جاتا ہے کہ بچہ مستقبل میں اچھے کردار کا مالک ہوگا۔ علیؑ و محمدؐ نام رکھنے سے کوئی علیؑ و محمدؐ نہیں ہو جاتا، لیکن یہ امید ضرور رہتی ہے کہ علیؑ و محمدؐ نہیں ہو سکتا تو کم از کم ان کا پیرو اور فرمانبردار ضرور ہوگا۔ لیکن یہی نام جب کسی عالم الغیبِ ہستی کی طرف سے ہوتا ہے تو اس کی حیثیت شگون کی نہیں ہوتی، بلکہ اس میں مستقبل کے کردار کی ضمانت ہوتی ہے اور یہ شکل پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر اس کا کردار نام کے مطابق ہونے والا نہیں تھا تو آپ نے مستقبل سے باخبر ہونے کے باوجود یہ نام کیوں رکھا۔ ایسے حالات میں اپنے علم کی لاج رکھنے کے لیے عالم الغیب کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ کردار کو دیکھ کر نام مقرر کرے تاکہ اپنے علم کے دامن پر دھبہ نہ آنے پائے۔

مالکِ کائنات عالم الغیب ہے۔ وہ مستقبل کے حالات سے باخبر ہے۔ ہر شے کا مستقبل اس کے ہاتھوں میں ہے اور اس نے اپنے حبیب کا نام محمدؐ رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے پیغمبرؐ کی پوری زندگی کا جائزہ لے لیا ہے۔ اور اس کے بعد انھیں محمدؐ قرار دیا ہے۔ اب یہ نام صرف نام نہیں ہے بلکہ ایک

ضمانت اور ذمہ داری ہے کہ اس کی پوری زندگی محمدؐ ہے۔ یہ اٹھے تو محمدؐ ہے۔ بیٹھے تو محمدؐ ہے۔ سوئے تو محمدؐ ہے جاگے تو محمدؐ ہے۔ بندگی کرے تو محمدؐ ہے۔ مزدوری کرے تو محمدؐ ہے۔ بزمِ اصحاب میں رہے تو محمدؐ ہے۔ اور عرشِ اعظم کی سیر کرے تو محمدؐ ہے۔

مرسلِ اعظم کے اسمِ گرامی کے سلسلے میں ایک نکتہ یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ مالک نے اپنے حبیب کے دو نام رکھے ہیں۔ جنابِ عیسیٰ کے ذریعہ یہ اعلان کرایا ہے کہ میرے بعد آنے والے نبی کا نام احمد ہوگا۔ اور ہم سے یہ بتایا ہے کہ ہمارا یہ حبیب محمدؐ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دو نام کیسے؟ اور اس نام بدلنے کا فلسفہ کیا ہے؟ کیا یہ نبی وہی نہیں ہے جس کی خبر عیسیٰ نے دی تھی۔ کیا پروردگار کو یہ یاد نہیں رہا کہ اس نے عیسیٰ کی زبان سے احمد نام بتایا ہے۔ کیا جنابِ عیسیٰ نے صحیح نام نہیں بتایا تھا۔ نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ احمدؐ بھی ہے اور محمدؐ بھی، اور اس کا نکتہ اس وقت ظاہر ہوگا جب دونوں کے معنی پر غور کیا جائے گا۔

یاد رکھیے! عربی زبان میں احمد کے معنی ہیں بہت زیادہ تعریف کرنے والا۔ اور محمد کے معنی ہیں جس کی بہت زیادہ تعریف کی جائے یہ رسولِ احمدؐ بھی ہے اور محمدؐ بھی۔ فرق یہ ہے کہ دنیا میں آنے سے پہلے احمدؐ تھا، اور آیا، تو محمد بن کر۔ سمجھے آپ! یہ کیا انقلاب ہو گیا اور مالک نے کس عظیم کردار کی طرف اشارہ کر دیا۔ حقیقتاً قدرت

یہ بتانا چاہتی ہے کہ بندے نے عالم ظاہر میں قدم رکھنے سے پہلے عالم  
الوار میں اتنی زیادہ حمد کی ہے کہ ہم نے اسے قابلِ حمد و ثناء بنا دیا ہے۔ کل  
جب یہ ہماری حمد کر رہا تھا تو احمد تھا۔ آج جب ہم نے اسے قابلِ حمد  
ثناء بنا دیا ہے تو محمدؐ ہو گیا ہے۔

لائے دنیا کوئی ایسا انسان جسے مالک نے یہ شرف بخشا ہو اور  
پیش کرے کوئی ایسا کردار جسے یہ بلندیاں نصیب ہوں۔ یہ عظمتیں تو صرف  
محمدؐ کے گھرانے میں دیکھی ہیں جہاں ایک حسنِ کردار میں محمدؐ ہے تو  
دوسرا بلندیوں میں علیؑ۔ ایک اپنے اقدام میں حسنؑ ہے تو دوسرا  
اپنے عمل میں حسینؑ۔ جو ہے وہ صاحبِ عظمت۔ جو ہے وہ صاحبِ کردار  
اور کردار میں بھی ایسی یگانگت اور یکسانیت کہ جسے دیکھا محمدؐ ہی نظر آیا  
اول بھی محمدؐ، اوسط بھی محمدؐ، آخر بھی محمدؐ اور کل کے کل محمدؐ۔

معصوم تو معصوم، اس گھر میں ایسے غیر معصوم بھی ملتے ہیں جنہوں نے  
آغوشِ عصمت میں تربیت پانے کے بعد اپنے کو عظمتِ کردار کی اس منزل  
پر پہنچا دیا ہے جہاں تک عام انسانوں کو پہنچنا دشوار بلکہ ناممکن ہے  
۔ وہ صاحبِ عصمت علیؑ تھے جنہوں نے میدانِ جنگ میں اعلان کیا  
تھا۔ ابوطالب کے لال کو موت سے اتنا ہی انس ہے جتنا بچہ کو شیرِ مادر  
سے ہوتا ہے اور یہ کس شہزادہ قاسمؑ ہے جو اعلان کر رہا ہے چچا موت  
شہد سے بھی زیادہ شیریں ہے۔

کیا تاریخ میں کبھی ایسے بچے بھی ملے ہیں جو موت کے لیے تڑپ رہے

ہوں اور تلواروں سے کھینے کے لیے بیچین ہوں۔ یہ حسین ہی کے لشکر کا خاصہ ہے جہاں ایک ایک بچہ موت کی گودی میں کھینے کے لیے بیچین اور ایک ایک جوان عروسِ موت سے ہمکنار ہونے کے لیے بیتاب ہے۔

تاریخِ کربلا گواہ ہے کہ جب حسین نے عاشور کی شب محضرِ شہادت پیش کر کے ایک ایک کو خبرِ شہادت سنائی تو اصحاب و اعراب میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مرنے کی خبر سنی گویا عروسی کا مردہ سُنا یا گیا۔ گلا کٹنے کی اطلاع کیاملی گویا کوئی عظیم انعام ہاتھ آ گیا۔ ہاں ایک کمسن بچہ تھا جس نے اپنا نام نہیں سُنا تو بیچین ہو کر خمیرہ کے ایک گوشے میں آیا اور زار و قطار رونا شروع کیا۔ ہائے میرا مقدر۔ سب گلا کٹائیں گے میں رہ جاؤں گا۔ سب مولا کے کام آئیں گے میں نہ آسکوں گا۔ سچ ہے کیوں نہ ہو میرا مقدر ہی ایسا ہے۔ بچپن میں باپ کے سایہ سے محروم ہو گیا۔ اب ایک منزلِ شہادت رہ گئی تھی اس سے بھی محروم ہو جاؤں گا۔ روتے روتے دل میں خیال آیا کہ میرے بازو پر ایک تعویذ بندھا ہے۔ جو میرے بابا نے مشکل کے وقت کے لیے بانڈھ دیا تھا۔ دیکھوں شاید میری مشکل کا حل نکل آئے۔ شاید میری خوش قسمتی کا راز اسی دستاویز میں پوشیدہ ہو۔

یہ سوچ کر تعویذ کو کھولا۔ غور سے پڑھا۔ کیا دیکھا۔ باپ نے لکھا ہے۔ میرے لال قاسم! اگر تیرے چچا پر وقت پڑ جائے

تو ان کی نصرت ضرور کرنا اور ان پر قربان ہو جانا۔ قربانی کا پیغام  
سنا۔ دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ خوشی خوشی چچا کی خدمت  
میں آئے۔ چچا! ذرا اس تحریر کو تو پڑھیں۔ امام حسین نے کہا بیٹا  
یہ کیا ہے؟۔ عرض کی میرے بابا کا نوشتہ ہے۔ اس میں کچھ آپ  
ہی سے متعلق لکھا ہے۔ حسین نے تعویذ کو لیا۔ بھائی کی تصویر لگا ہوں میں  
پھر گئی۔ کمالِ اشتیاق سے تحریر کو دیکھا اور ایک مرتبہ بیساختہ رونے  
لگے۔ قائم نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ چچا! اس میں رونے کی کیا  
بات ہے۔؟ آپ گریوں فرما رہے ہیں۔؟ حسین نے دل سنبھال  
کر کہا، میرے لال! یہ تحریر لائے ہو یا اپنی موت کا پیغام لائے ہو؟  
بیٹا! یہ مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ کل تو یہ بھرا گھر اُجڑنے والا ہے۔  
میں نے تیری کسئی کو دیکھ کر تیری شہادت کی خبر نہیں سُنائی تھی۔ تیرے نام  
کے ساتھ موت کا تصور میری نگاہوں کے سامنے بھائی کی مٹی ہوئی تصویر  
کا خیال لے آتا تھا۔ اے قائم! تیرا کیا ذکر ہے۔ کل تو تیرا بھیتا  
علی اصغر بھی قربان ہو جائے گا۔ اپنی موت کے تصور پر ہنسنے والا  
قائم، علی اصغر کا ذکر سننے ہی چونک پڑا۔ چچا! یہ آپ نے کیا فرمایا۔  
میرا بھیتا علی اصغر۔؟ میرا چھوٹا بھیتا علی اصغر۔؟ اصغر کی  
شہادت کے کیا معنی۔؟ کیا اشقیاءِ خمیمہ میں داخل ہو جائیں گے؟  
ہاشمی غیرت دار کا سارا بدن کانپنے لگا۔ اشقیاء اور خمیمہ۔؟  
یہاں تو محدثاتِ عصمت و طہارت ہیں۔ یہاں تو خاندانِ رسالت کی

شہزادیاں ہیں۔ امام حسین قاسم کے جذبات کو سمجھ گئے۔ فرمایا  
 نہیں بیٹا قاسم۔ میں اصغر کو لب کر میدان میں جاؤں گا۔  
 دل چاہتا ہے عرض کروں۔ حسین کے نورِ نظر قاسم۔ ! ہاشمی  
 غیرت دار قاسم۔ تم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اشقیاءِ خیموں کے اندر  
 آجائیں۔ یہ عاشور کی رات ہے۔ کاش تم عصر عاشور ہوتے تو  
 دیکھتے تخیموں میں آگ لگی ہوئی ہے۔ چادریں چھن رہی ہیں۔ اور  
 سیدانیاں ایک خیمہ سے دوسرے خیمہ کی طرف دوڑ رہی ہیں۔  
 رات گزری۔ عاشور کا لڑتا ہوا سورج طلوع ہوا۔ فوج دشمن  
 میں جنگ کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ حسین اپنی مختصر سی سپاہ کو ترتیب  
 دینے لگے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ تیروں کا مینہ برسے لگا۔ اصحاب  
 نے میدان میں قدم جمائے۔ بہت سے چاہنے والے دلِ شجاعت  
 دے کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ ظہر کا ہنگام آیا۔ نمازِ ظہر  
 ادا ہوئی۔ اصحاب کے بعد اعزاز کی باری آئی۔ ایک مرتبہ  
 اُم فروہ کالال دستِ ادب جوڑ کر سامنے آیا۔ چچا ! اب اجازت دیجیے۔  
 آخر میں کب تک ان قربانیوں کو دیکھتا رہوں گا۔ اب دل تنگ  
 ہو رہا ہے اور آپ کی بیکسی تڑپا رہی ہے۔ حسین نے قاسم کو سر سے پیر  
 تک دیکھا۔ قاسم کے چہرے میں مرحوم بھائی کی تصویرِ نظر آئی آنکھوں  
 میں آنسو آگئے۔ دل سنبھال کر فرمایا۔ میرے لال! کیا واقعہ مرنے پر  
 آمادہ ہو گئے۔ بیٹا کیا اب بھیا کی تصویرِ خاک میں مل جائے گی؟ قاسم

نے اصرار کیا۔ حسین دل سنبھالتے سنبھالتے بھی ہاں نہیں کہہ سکے۔  
 ایک مرتبہ قاسم نے جھک کر سرفروں پر رکھ دیا اور پیروں کو چومنا شروع  
 کر دیا۔ حسین نے تڑپ کے گلے سے لگا لیا۔ دل نے آواز دی۔ جاؤ  
 میرے لال جاؤ۔ آج تو مجھے سارے داغ اٹھانا ہیں۔ جاؤ قاسم  
 جاؤ۔ چچا تمھاری لاش پر بھی آنسو بہائے گا۔ جاؤ بیٹا جاؤ۔  
 اب ان آنکھوں سے بھیا کی مٹی ہوئی تصویر بھی دیکھوں گا۔

اجازت ملی، قاسم چلے۔ سارے مناظر کا ذکر نہیں کروں گا۔ بس  
 ایک منظر۔ زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گرے، چچا کو آواز دی۔ حسین  
 تیزی سے بڑھے۔ کیا دیکھا۔ قاتل سر ہانے تلوار لیے بیٹھا ہے اور گلا کاٹنا  
 ہی چاہتا ہے۔ خدا کسی چچا کو منظر نہ دکھائے۔ تڑپ کر آواز دی۔ قاسم گھبرانا  
 نہیں، میں آگیا۔ بیٹا! تیرا چچا تیرے قریب ہے۔ قاتل نے مولا کی یہ آواز  
 سنی۔ لشکر کو آواز دی۔ دوڑو! میں حسین کے حملہ کی زد پر آگیا۔ لشکر تیزی  
 سے بڑھا۔ ادھر حسین۔ ادھر سے بڑھتا ہوا لشکر اور سچ میں قاسم کا جسم نازنین۔

گھوڑے قاسم کے جسم نازنین سے گزر گئے۔ کس لال کے سینے کی ہڈیاں  
 ٹوٹنے لگیں۔ جب گھوڑے کی ٹاپ سینے پر پڑتی تھی تو بیساختہ زبان سے  
 نکل جاتا تھا۔ چچا۔ چچا۔ چچا۔ حسین کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ہائے میرے قاسم  
 میرے لال۔ میرے جان برادر۔ تیرا چچا شرمندہ ہے کہ تیرے کام نہ آسکا اور اس  
 وقت آیا جب تیرا جسم گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہو گیا۔

” اَنَا لِلّٰهِ وَاَنَا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ “



اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ  
 بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ  
 الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ • وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ  
 عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ • سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا  
 اَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ  
 وَاللّعنةُ الدّٰئِمَةُ عَلٰى اَعْدَائِهِمْ وَقَاتِلِيْهِمْ  
 اَجْمَعِيْنَ مِنَ الْاَن اِلَى قِيَامِ يَوْمِ الدِّيْنِ •  
 اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ الْحَكِيْمُ فِيْ كِتَابِهِ الْكَرِيْمِ  
 ” وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ “

مالک کائنات اپنے حبیب کا تعارف کرتے ہوئے ارشاد

فرمایا ہے۔ ” یہ محمدؐ صرف میرا رسول ہے۔“

اس میں رسالت کے علاوہ کوئی چیز تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا

قرآن حکیم کے اس فقرہ کے بارے میں آج مجھے اس نکتہ پر تبصرہ

کرنا ہے کہ مالکِ کائنات نے اپنے حبیب کے رسول ہونے کا اعلان کیا ہے۔ رسول بنانے کا اعلان نہیں کیا۔ قدرت یہ بتانا چاہتی ہے کہ آج میں جس رسالت کا اعلان کر رہا ہوں، وہ آج کی نہیں بلکہ یہ جیب سے دنیا میں آیا ہے رسول ہی بن کر آیا ہے۔

رسالت کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان یہ ایک عجیب و غریب بحث ہے کہ رسول، رسول بن کر دنیا میں آتا ہے یا یہاں آنے کے بعد دنیا کے دوسرے عہدیداروں کی طرح رسول بنا یا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا ہے جو مرسلِ اعظم کو ابتداءً حیات سے رسول نہیں مانتا اور اس کا یہی خیال ہے کہ پیغمبر بھی دنیا کے دوسرے عہدیداروں کی طرح ایک مدت گزرنے کے بعد رسالت کی ذمہ داریاں سنبھالتا ہے اور مالکِ کائنات اس کی صلاحیتوں کا تجربہ کرنے کے بعد اسے منصب عطا کرتا ہے۔ ان مسلمانوں کے نزدیک بعثت کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر میں اللہ نے پیغمبر کو رسالت کے عہدے سے سرفراز فرمایا۔ اس سے پہلے وہ سب کچھ تھے لیکن رسول نہیں تھے۔ اسی رسول نہ ہونے کے نظریہ نے دنیا کو دو دائرِ پیغمبر پر بحث کرنے کا موقع دیدیا اور اب مسلمانوں ہی میں یہ بحث چھڑ گئی کہ رسول نہ ہونے کے دور میں رسول کیسا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔ اور اس کے اعمال و کردار کی کیا نوعیت ہوتی ہے۔ ؟

بعض مسلمانوں نے تو صاف لفظوں میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ رسالت سے پہلے رسول ہر برائی کا مرتکب ہو سکتا ہے یہاں تک کہ کافر بھی ہو سکتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں — یہ ہے مسلمانوں کا ذہن — اور یہ ہے ان کا رسول — حیرت تو یہ ہے کہ یہ خیالات اس دور میں پیدا کیے جا رہے ہیں جب دنیا کی ہر قوم اپنے لیڈر اور اپنے رہنما کے کردار کو بلند کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔

مجھے اس وقت ان نظریات پر تبصرہ کرنا نہیں ہے — صرف یہ کہنا ہے کہ اگر یہ نظریہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو مرسلِ اعظم کی حیاتِ طیبہ پر کوئی اثر نہ پڑے گا، اور نہ آپ کی زندگی کو نشانہٴ اعتراض بنایا جاسکتا ہے — اعتراض میں صاف لفظوں میں اقرار کر لیا گیا ہے کہ یہ ساری باتیں رسالت سے پہلے پہلے جانتے ہیں۔ نبوت و رسالت کے بعد ان برائیوں کا کوئی امکان نہیں ہے۔ نبوت پانے کے بعد نبی عالم بھی ہوتا، اور معصوم بھی۔ بلند کردار بھی ہوتا ہے اور بلند افکار بھی — اب مرسلِ اعظم کی زندگی میں اس دور کا جائزہ لینا پڑے گا۔ جب آپ رسول نہیں تھے — اگر ایسا کوئی دور مل گیا تو آپ کا کردار موضوعِ گفتگو بنایا جائے گا اور ایسا کوئی دور نظر ہی نہ آیا تو نبوت کے کردار پر کسی بحث کی گنجائش نہیں آئیے دیکھیں کہ پیروردگارِ عالم کا ارشاد کیا ہے اور جس نے رسالت کا منصب دیا ہے اس نے کب اور کن حالات میں دیا ہے — قرآن مجید کا اعلان ہے۔ ”هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ

” وہ خدا وہ ہے جس نے مکہ والوں کے درمیان ایک رسول

بھیجا ہے جو انہیں میں سے ہے۔“

اربابِ نظر غور کریں۔ مالکِ کائنات نے مکہ والوں میں رسول بھیجا ہے، بنایا نہیں۔ — بھیجنے اور بنانے کا فرق محسوس کرنا ہے تو ایک مرتبہ دنیا کے عہدوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ دینا کے عہدوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عہدہ وہ ہوتا ہے جس میں بھیجنے کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ جو صاحبِ صلاحیت جہاں ہوتا ہے اسے وہیں عہدہ دار بنا دیا جاتا ہے۔ جیسے سفارت کا عہدہ کہ کسی ملک میں سفارت کا عہدہ اس ملک کے باشندے کو نہیں دیا جاتا ہے بلکہ ہر ایک اپنے ملک کے آدمی کو سفیر بنا کر دوسرے ملک میں بھیجا کرتا ہے ایسے عہدوں میں یہی دیکھنا ہے کہ حکومتیں کسی آدمی کو دوسرے ملک میں عام باشندوں کی طرح بھیج کر ایک عرصہ کے بعد اپنا سفیر بنا دیا کرتی ہیں یا سفارت کی ساری ذمہ داریاں دے کر بھیجا کرتی ہیں۔ کھلی ہوتی بات ہے کہ سفیر دوسرے ملک میں نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ اپنے ملک میں بنا کر دوسرے ملک میں بھیجا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بھیجنے میں دو معانی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ جسے بھیجا گیا ہے اسے پہلے عہدہ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد بھیجا گیا ہے اور دوسری بات یہ کہ جہاں بھیجا گیا ہے عہدہ وہاں کا نہیں ہے بلکہ اپنے ہمراہ کہیں سے لیکر آیا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دنیا کی عام حکومتیں اپنا نامزدہ بھیجیں تو کسی انسان کو یہ کہنے کا حق نہیں پیدا ہوتا کہ ابھی تو آپ آئے ہیں دس سال

کام کیجیے، اس کے بعد ہم آپ کی سفارت پر غور کریں گے بلکہ جس دن سفیر اپنے ملک سے نکلتا ہے اسی دن اسے سفیر تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ چاہے دوسرے ملک میں پہنچنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جائے اور جب مذہب کی بات آتی ہے تو خدائی نمائندہ کے بارے میں یہ بحثیں اٹھائی جاتی ہیں کہ وہ کب سے نبی ہے، اور کب سے رسالت کے منصب پر فائز ہوا ہے۔

قرآن حکیم نے بعثت کا لفظ منتخب کر کے مسلمانوں کے ذہنوں کو بیدار کر دیا کہ ہم نے مکہ میں رسول بھیجا ہے، رسول بنایا نہیں بلکہ رسول بنا کر مکہ میں بھیجا ہے۔ اب اندازہ کرو کہ یہ بشر نہیں ہے رسول ہے اور اس کی رسالت تمہارے گھر کی نہیں ہے بلکہ ہمارے گھر کی ہے۔

یاد رکھیے۔! نمائندگی والے عہدے عام ملکی عہدوں سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہوتے ہیں۔ ملک کے اندر کے عہدوں میں عہدہ دار نظام حکومت کے زیر نگرانی کام کرتا ہے۔ اسے ہر وقت حکومت کی کڑی نگرانی کا سامنا ہوتا ہے۔ احکام حکومت کے ہوتے ہیں اور عمل درآمد حکام کا۔ اور نمائندگی کے عہدوں کا اندازہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہاں سفیر کے افکار و کردار پر اتنا اعتماد ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہر عمل میں حکومت کی رائے کا منتظر نہیں رہتا، بلکہ حکومت کی پوری پالیسی کو سمجھ کر دوسرے ملکوں میں جاتا ہے، اور اسی پالیسی کے تحت معاملات طے کرتا رہتا ہے۔ اور حکومت اسے سفیر کی رائے نہیں قرار دیتی

بلکہ اپنی رائے قرار دیتی ہے۔

تو جب عام انسان اپنے عہدوں میں اتنی احتیاط برتتے ہیں تو مالکِ کائنات کی احتیاط کا کیا عالم ہوگا۔ اور وہ سفیر بنائے گا تو اس کا کردار کتنا بلند ہوگا۔۔۔؟ یہی وجہ ہے کہ مالکِ کائنات نے جسے بھی سفارت کا عہدہ دیا اسے اپنی پوری تنظیم سے باخبر کر کے دنیا میں بھیجا، تاکہ یہ مشیت کی روشنی میں اپنے اعمال کو انجام دیتا رہے اور میں یہ اعلان کرتا رہوں کہ یہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا، یہ جو کچھ کہہ رہا ہے سب میری وحی کے مطابق ہے۔۔۔ اس نے سنگریزے خود نہیں پھینکے ہیں، میں نے پھینکے ہیں۔۔۔ اس کا ارادہ اپنا ارادہ نہیں ہے، میرا ارادہ ہے۔

مسلمانو! کیا کوئی عام خاطر اور گنہگار انسان زندگی کے کسی موڑ پر یہ منزل حاصل کر سکتا ہے کہ اس کا قول و فعل اس کی رفتار و گفتار سب مالکِ کائنات کی طرف منسوب ہو جائے۔

مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ یہی مسلمان جب قرآن مجید میں یہ آیت

پڑھتا ہے:

« وَمَا أَسْأَلُكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ »

(اے رسول! ہم نے آپ کو رحمت (عالمین کیلئے) بنا کر بھیجا ہے)

تو کہتا ہے کہ حضور یہاں آکر رحمت نہیں بنے بلکہ جب آئے تھے تو رحمت تھے اور جب عرشِ اعظم پر جلوہ فرما تھے جب بھی رحمت ہی تھے اور جب یہ

آیت سامنے آتی ہے :

”وَبَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا“

(اس نے مکہ والوں میں رسول بھیجا ہے)

تو یہ بحثیں شروع ہو جاتی ہیں کہ دنیا میں آنے کے بعد کب سے رسول ہو گئے یہ ایمان کی کمزوری اور غسل سے فرار کی صورت ہے جہاں مسلمان کلمہ پڑھنے کے بعد بھی نبی کی زندگی پر بھروسہ کرنا نہیں چاہتا اور اسی نا فہمی کا نتیجہ تھا کہ عمر نبوت پڑھتی رہی اور مسلمان منصب کا فیصلہ نہ کر سکے یہاں تک کہ حدیبیہ کی منزل آگئی اور فیصلہ نہ ہو سکا۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ نبی کی زندگی کا آخری وقت آگیا اور مسلمان فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ رسول ہیں یا نہیں۔

اگر ایمان اسی کا نام ہے تو نفاق کیلئے۔ اگر اسلام اسی کو کہتے ہیں تو کفر کے معنی کیا ہوں گے۔؟ یہی ایک سلسلہ نا فہمی ہے جو صدر اسلام سے چلا آ رہا ہے اور آج تک باقی ہے۔ اور آج بھی یہ بحثیں جاری ہیں کہ نبی کب سے نبی ہوتا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مسلمان نبوت و رسالت کے مسائل خود کیوں حل کرنا چاہتے ہیں۔ اور نبی ہی سے دریافت کیوں نہیں کرتے کہ آپ کی نبوت کی منزل کیا ہے۔؟ آئیے چلیے، حضور سے پوچھیں کہ حضور کی نبوت کا سلسلہ کب سے شروع ہوا ہے۔ سرکارِ کو رسالت کا عہدہ کب ملا؟ آواز آتی ہے۔ ”كُنْتُ نَبِيًّا وَادَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّينِ“ (حدیث)

(میں اُس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ آب و گل کے درمیان تھے)  
اب پہچانا آپ نے اس وفادار اُمت کو۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ  
میں آدمؑ سے پہلے نبی تھا اور یہ سوچ رہے ہیں کہ دنیا میں آنے کے بعد  
بھی نبی تھے یا نہیں۔ افسوس اس اُمت نے عرفانِ نبی میں کتنی ٹھوکریں  
کھائی ہیں اور نبوت کی زندگی کو کتنا بے وزن بنا دیا ہے۔

حیرت تو یہ ہوتی ہے کہ یہ مسلمان ہمارے اوپر یہ اعتراض کرتے  
ہیں کہ یہ قوم نبوت کی معرفت نہیں رکھتی۔ اسے پیغمبرِ اسلام کی عظمتوں کا  
علم نہیں ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ اگر عرفانِ نبوت یہی ہے تو ہم بے معرفت  
ہی اچھے ہیں، اور اگر اسلام اسی تو ہیں پیغمبر کا نام ہے تو اس اسلام  
سے مشرکین کا کفر ہی اچھا تھا جو کم از کم صادق و امین تو سمجھتے تھے یہاں  
تو چالیس سال سے پہلے ہر بُرائی کا جواز ڈھونڈا جا رہا ہے۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے مسلِ عظیم  
کو اشرف المرسلین اور خاتم النبیین قرار دیا ہے۔ اور قرآنِ حکیم میں  
جو انبیاءِ سابقین کی تاریخ ملتی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیگر  
انبیاء کا مرتبہ رسولِ اسلام سے بلند تھا۔ آئیے ذرا ایک نظر اللہ کے  
عہدہ داروں کی تاریخ پر ڈالیں۔ سب سے پہلے جنابِ آدمؑ کا نام آتا ہے  
جن کے منصب کا اعلان ان کی خلقت سے پہلے ہی ہو گیا اور مالکِ  
کائنات نے سپیکرِ آدمؑ کی تخلیق سے پہلے اعلان کر دیا کہ:

”میں روئے زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“

یعنی اے ملائکہ سو شیا رہو جاؤ۔ اور اے قرآن کو پڑھنے والو  
پوش میں آ جاؤ۔“ کہ جو بنایا جا رہا ہے وہ عام انسان نہیں ہے بلکہ خلیفۃ اللہ  
ہے۔ اب پہچانا آپ نے۔ آدم کی خلافت اور ان کے منصب کا  
سلسلہ کہاں سے شروع ہوا ہے؟

جناب آدم کے بعد جناب ابراہیم کے حالات دیکھیے۔ جہاں کمال  
عقل و شعور اور احساسِ ذمہ داری کا یہ عالم ہے کہ زندگی کی ابتدائی منزلوں  
سے گذر رہے ہیں اور کائنات کی بے ثباتی، دنیا کی ناپائیداری کا حوالہ دیتے  
ہوئے رب العالمین کی حکمت و برتری کا اعلان کر رہے ہیں۔

حضرت موسیٰ، فرعون کی آغوش میں ہیں اور نبوت کے ان کمالات کا  
مظاہرہ کر رہے ہیں جنہیں دیکھ کر فرعون جیسا مغرور و متکبر انسان بھی یہ  
اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ بچہ عام بچوں جیسا بچہ نہیں ہے اس کا تو  
انداز ہی نرالا ہے۔ اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ وہی ہے جس کے بارے  
میں مجھے خبر دی گئی ہے کہ میری مملکت میں بچہ پیدا ہوگا جو آگے چل کر میری  
حکومت کا تختہ الٹ دے گا۔

حضرت عیسیٰؑ ماں کی گودی میں ہیں اور آواز دے رہے ہیں:  
”التَّائِي الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا“ اللہ نے مجھے کتاب دی ہے  
اور نبی بنایا ہے۔“

بتانا یہ چاہتے ہیں کہ منصبِ نبوت سن و سال اور عمر کا محتاج نہیں ہے  
میں آغوشِ مادر میں ہوں لیکن مجھے نبوت مل چکی ہے۔

مسلمانو! ذرا انصاف سے بتاؤ تمہارا رسول کیونکر افضل المرسلین ہوگا۔ مرسلین کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ قبلِ خلقت حاملِ منصب تھے۔ انبیاء کا کردار گواہ ہے کہ وہ بچپن ہی سے اپنی نبوت کا اعلان و اظہار کیا کرتے تھے۔ اور ایک تمہارا نبی ہے جو چالیس سال کی عمر تک نبوت سے محروم رہا۔ کیا ایسے نبی کو بھی افضل الانبیاء کہا جاسکتا ہے۔

یاد رکھو! اگر حضور کی افضلیت کا تحفظ کرنا ہے، اگر اسلامی غیرت کو زندہ رکھنا ہے۔ تو مانتا پڑے گا کہ اگر سارے انبیاء قبلِ خلقت نبی تھے۔ اگر آدم پیکرِ خاکی کے قبل خلیفۃ اللہ تھے تو میرا نبی اُس وقت بھی نبی تھا جب کائنات عدم کے سنڈے میں سو رہی تھی۔ جب آدم آب و گل کے منزل سے گزر رہے تھے۔ جب کون و مکان میں کچھ نہیں تھا لیکن خدا کی خدائی تھی اور محمد کی جلوہ نمائی۔

ایسا ہی ایک ماحول تھا جب مالک نے جبریل کو پیدا کر کے ان سے پوچھا تھا کہ اے جبریل! بتاؤ تم کون ہو اور میں کون ہوں؟ اور جبریل حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہے تھے کہ پردہ غیب سے ایک آواز آئی تھی۔ جبریل کہہ دو۔ ”تو رب جلیل ہے اور میں عبد ذلیل۔ تیرا نام جلیل ہے اور میرا نام جبریل ہے۔“

ملک نے جواب دیا۔ ملکوتیت کی عزت بچی۔ عصمت کا وقار بڑھا۔ اور مجھے کہنا پڑا کہ جہاں خدا کی خدائی تھی وہیں محمد کی جلوہ نمائی۔ اور جس ماحول میں محمد کی جلوہ نمائی تھی اسی ماحول میں عیسیٰ کی

## مشکل کشائی۔

منصبِ الہی کی اسی برتری کے ظاہر کرنے اور سن و سال کے اسی امتیاز کو مٹانے کے لیے مہرِ اعظمؑ میا ہلہ کے میدان میں سب سے آگے حسینؑ کو لے گئے تھے گویا نبیؐ یہ اعلان کر رہے تھے کہ دیکھو جو عمر میں سب سے کم ہے وہ حق کے معاملہ میں سب سے آگے آگے ہے۔ ابھی تم نے حق کی عظمتوں کو نہیں پہچانا ہے۔ ابھی تمہیں اہلِ منصب کی بلند یوں کا علم نہیں ہے۔

اریابِ عزا —! رسولؐ نے میا ہلہ کے میدان میں منصب دار کے بچپن کی عظمت کا اظہار کیا اور حسینؑ نے کربلا میں شیرِ خوار کی عظمت کا اعلان کیا۔ حسینؑ نے آواز دی، 'دنیا سے اسلام ابھی تو منصب دار کی عظمت سے نا آشنا ہے تو دیکھو میرے گھر کا شیرِ خوار کتنا بلند کردار اور باشعور ہوتا ہے۔'

صدائے استغاثہ کے بعد جب علیؑ نے اپنے کو جھولے سے گرا دیا اور خمیہ میں کُہرام برپا ہوا تو سرکارِ سید الشہداءؑ و خمیہ پر آئے — فرمایا، بہنِ زینبؑ! یہ کُہرام کیسا ہے؟ عرض کی بھیا! آپ کی آوازِ استغاثہ سن کر علیؑ نے اپنے کو جھولے سے گرا دیا ہے۔ — حسینؑ نے سر جھکا لیا۔ میں سمجھ گیا بہن، میرا صُغر کیا چاہتا ہے۔ — اچھا لاؤ اب اسے میرے حوالے کر دو۔ بہن نے عرض کی بھیا! وہ کسی کی گود میں نہیں آ رہا ہے۔

حسین خیمہ میں داخل ہوئے۔ اصغر کے قریب آئے۔ باپ نے کیا کہا، کون سمجھے۔ اور بیٹے نے کیا سمجھا، کون جانے؟ ہاں اتنا سب نے دیکھا کہ باپ نے ہاتھ پھیلانے اور پچھہمک کر باپ کی گودی میں آگیا۔ عجب نہیں مقصد یہ رہا ہو، اصغر! چلو۔ میرے لال۔ اب تمھاری بھی قربانی کا وقت آگیا۔ چلو بیٹا! اپنے ہاتھوں سے یہ آخری قربانی بھی بارگاہِ احدیت میں پیش کر دوں۔

گودی میں لیا۔ چلے۔ درخیمہ کے قریب پہنچے۔ دیکھا، ماں سر جھوکائے کھڑی ہے۔ اشارہ کو پہچانا۔ فرمایا، رباب! خیر تو ہے۔ یہاں کیوں کھڑی ہو۔؟ کہا، وارث کیا کروں۔ دل نہیں مانتا ہے، آپ میرے لال کو وہاں لیے جاؤ ہیں جہاں صبح سے جو بھی گیا ہے، واپس نہیں آیا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ وہ ماں کیا کرے جسے ایک طرف شرم کھائے جا رہی ہے اور دوسری طرف بچہ کی محبت دل کو بڑھائے دے رہی ہے۔ نظروں سے اپنے لال کی بلائیں لیں دل نے دھیرے سے آواز دی۔ جاؤ۔ اصغر جاؤ۔ میں سمجھ گئی اب یہ جھولا پھرنے آباد ہوگا۔ میرے لال! ایک دفعہ اپنی چاندسی شکل پھر دکھا دینا۔ بیٹا! محبت بچپن کی دے رہی ہے۔ لیکن کیا کروں، میرے لال۔ دین کا معاملہ ہے۔ مولا کی زندگی کا سوال ہے۔ کاش تیری قربانی سے تیرے بابا کی جان بچ جاتی۔ دل میں ایسے ہزاروں خیالات اُبھر رہے تھے۔

جذبات کا ایک سیلاب تھا جو اُمڈ اچلا آ رہا تھا۔ آنکھوں سے  
 آنسو کا ایک دریا تھا جو بہتا چلا جا رہا تھا۔ حسین بھی آخری پتے  
 ماں کی یہ حالت دیکھ کر تڑپ گئے۔ مشیت کی پابندیاں — سر  
 جھکا کر فرمایا، لیکن رباب تمہارا بچہ تو کمسن ہے، شاید کسی کو اس کے حال  
 پر رحم آجائے۔ دھڑکتا ہوا دل ٹھہرا۔ ہاں لشکرِ نیرید میں کوئی تو  
 صاحبِ اولاد ہوگا۔ کسی کے پہلو میں تو دل ہوگا۔ کوئی تو میرے  
 بچے کے نیلے ہونٹوں کو دیکھے گا۔ یہ خیالات ذہن میں گونج ہی رہے  
 تھے کہ ایک مرتبہ پھر خیال کا رخ بدل لایا۔ ارے جسے شہزادی لیلیٰ کے  
 لال پر رحم نہ آیا اسے میرے اصغر پر کیا رحم آئے گا۔ جس نے عون و محمد کی  
 تصویر خاک میں ملا دی وہ میرے لال پر کیا رحم کرے گا۔ جس نے اُم فروہ  
 کے چاند کو گھوڑوں کی ٹالپوں سے پامال کر دیا وہ چھہہ سینے کی جان کا کیا خیال  
 کرے گا۔ دل تڑپا۔ جذبات کا طوفان اُمڈا، لیکن اللہ رے حوصلہ  
 خیمہ میں آکر بیٹھ گئیں۔ کچھ سہی، اب تو میں نے اپنے لال کو رخصت  
 کر دیا ہے۔ مولا سے بہتر محبت کرنے والا کون ہے۔ جب وہ قربان کرنے  
 پر آمادہ ہیں تو میں کون سوچنے والی۔

کاش! تاریخ کے پاس لفظیں ہوتیں۔ کاش مورخ کے پہلو  
 میں ماما بھرا دل ہوتا تو بتاتا کہ رباب کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔  
 لیکن افسوس۔ مقاتل خاموش ہیں۔ جذبات کی دنیا کچھ اشارے  
 دے رہی ہے۔ فضا میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ حسین، اصغر کے لیے پانی

مانگ رہے ہیں۔ اور ایک آواز گونج رہی ہے: اِقْطَعْ كَلَامَ الْحُسَيْنِ  
 حرمِ سلمہ! حسین کے کلام کو قطع کر دے۔ حرمِ سلمہ بڑھا۔ دوش سے کمان  
 ترکش سے تیر نکالا۔ تیر چیلہ میں جوڑا۔ حسین یہ سارا منظر دیکھ  
 رہے ہیں۔ ایک مرتبہ کمان کھینچی۔ گویا حسین کے سینے سے دل کھینچ  
 گیا۔ لیکن اللہ کے حوصلہ، ہاتھ کانپے نہیں۔ تیر چلا۔  
 اصغر کے گلے پر لگا۔ حسین کا بازو چھدا۔ باپ کا دل لوٹا۔  
 ماں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ بچے باپ کے ہاتھوں پر منتقل ہو گیا۔  
 حسین نے خونِ اصغر اپنے چہرے پر ملا۔ بیٹا! گواہ رہنا  
 قیامت کے دن یوں ہی رسول اللہ سے ملاقات کروں گا۔ نانا! یہ تحفہ  
 آپ کی امت نے دیا ہے۔ تھوڑی دیر ٹھہرے۔ رباب کی یاد  
 آئی۔ اصغر کو لے کر چلے۔ ماں کو بچے کا آخری دیدار کرا دیا جائے  
 درخیمہ تک آئے۔ دل تڑپا، واپس ہو گئے۔ پھر آئے۔  
 رباب کی بیکسی نے پلٹا دیا۔ سات مرتبہ آگے بڑھے اور پیچھے ہٹ  
 گئے۔ ہائے ماں بچہ کی اس حالت کو کیسے دیکھے گی۔؟ آخر میں  
 دل کو سنبھالا۔ یہ سوچ کر بڑھے کہ اب تو اصغر رخصت ہو چکے ہیں۔  
 ماں کو آخری دیدار سے کیوں محروم کیا جائے۔ درخیمہ پر آئے۔  
 آواز دی۔ رباب۔ اپنے بچے کو لے جاؤ۔ خیمہ میں  
 آواز پہنچی۔ رباب دوڑی۔ لیکن قدم نہ اٹھے۔ مامتانے  
 قدم تھام لیے۔ رباب کہاں جا رہی ہو۔؟ کیا سمجھتی ہو اصغر پانی

پی کر آئے ہیں — کیا تمہارا بچہ زندہ و سلامت آیا ہے — ؟  
 کیا پھر اپنے لال کی چاندسی شکل دیکھنے جا رہی ہو — ؟ قدم رُکے  
 — شوق نے پھر سہارا دیا — گرتے پڑتے درخیمہ تک پہنچیں۔

مامتا نے گھبرا کے گودی پھیلا دی — حسین سے سر اٹھا کر

دھیروے سے عبا کا دامن سر کا یا — ماں نے خون کی چھینٹیں

دیکھیں۔ دل دھڑکا — جھک کے غور سے دیکھا — ارے یہ تو گلے

پر تیر کا نشان ہے — یہ کُرتا تو خون میں تر ہے — بچہ تو مر چکا ہے

— کیوں آقا — ؟ آپ اصف کو ماں سے ملانے کے لیے لائے

ہیں ؟ میرے وارث — ! اصف کو پانی مل گیا ؟ والی ! دشمن کو میرے

لال پر رحم آگیا — ؟ یہ کہتے کہتے ایک مرتبہ اصف کی طرف مڑیں۔ مامتا

نے فریاد کی — رباب ! تو نے تیروں کی بوجھ میں بھیجا ہی کیوں تھا۔

خیال آیا میرا اصف کیا کہے گا۔ گھبرا کر پکار اٹھیں، بیٹا ! مجھے نہیں

معلوم تھا کہ اس سن کے بچے بھی نخر کر دیے جاتے ہیں۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

۹

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ  
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ • وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ  
 عَلَى سَيِّدِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ • سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا  
 أَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ وَ  
 لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى أَعْدَائِهِمْ وَقَاتِلِيهِمْ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ  
 أَقْبَلَعُدُّ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ  
 ” وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ “

مالک کائنات کا ارشاد ہے ” محمد صرف اللہ کے رسول ہیں “  
 ان کی حیات — ان کی موت — ان کا عمل — ان کا کردار ان کی عبادتیں  
 ان کی ریاضتیں، سب اللہ کے لیے ہیں۔ ان کی زندگی میں رسالت کے  
 علاوہ کوئی پہلو نہیں ہے۔ ان کے کردار میں کارِ رسالت کے علاوہ کوئی  
 گوشہ نہیں ہے۔ ایسی جامع رسالت اور ایسی ہمہ گیر نبوت جس کا تصور بھی  
 مشکل ہے اور جب ایک عام انسان ایسی رسالت کا تصور کرنے سے

قاصر ہے تو وہ رسول کا مرتبہ کیا سمجھے گا۔ رسول کو سمجھنے کے لیے رسالت کا سمجھنا ضروری ہے اور رسالت کے سمجھنے کے لیے جن شرائط کی ضرورت ہے ان کا کسی انسان میں فراہم ہونا مشکل نہیں بالکل ناممکن ہے۔

یہ ایک احسان تھا سرکارِ رسالت کا، کہ انھوں نے عرفانِ الہی کے ذیل میں اپنی معرفت کا بھی طریقہ بتا دیا اور یہ دشواری جو آج ہمیں معرفتِ رسول کے بارے میں پیش آرہی ہے یہ اس سے پہلے عرفانِ الہی کے بارے میں پیش آئی جس کا احساس خود سرکارِ دو عالم نے کیا اور ایک فقرے میں عرفان کے سارے راستے کھول دیے۔ عبدیت کو سہارا مل گیا۔ بندگی تیز تیز قدم بڑھانے لگی۔ عاجزی کے ماتھے پر آیا سوا پسینہ خشک ہو گیا اور سکونِ قلب نے آواز دی اس سے بہتر کوئی ذریعہ سکون نہ تھا۔ مرسلِ اعظم نے بارگاہِ احدیت میں دست بستہ آواز دی:۔

”مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ“

مالک! جو تیری معرفت کا حق تھا، وہ ادا نہ ہو سکا۔“

تجھے ویسے نہ پہچانا جو حق معرفت تھا۔ الوہیت، عبدیت کے ذہن میں کیونکر سماتی۔ مالک غلام کے تصورات کا کیونکر پابند بنتا۔ رب العالمین ذہنوں کی تراش خراش میں کیونکر آتا۔ یہ تیرا احسان تھا کہ تو نے اتنی ہی عاجزی کو قبول کر لیا اور یہ تیرا کرم تھا کہ تو نے ہماری طاقت سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کیا۔

مالک! تجھے اتنا ہی پہچانا ہے کہ تو ہمارے ذہنوں میں آنے والا

نہیں ہے۔ تو ہمارے دل و دماغ کا پابند نہیں ہے۔ اس سے زیادہ  
بندگی کے امکان میں کچھ نہیں ہے۔

مرسلِ اعظمؑ کا یہ اندازہ دیکھ کر دھڑکتا ہوا دل ٹھہر گیا عقیدہ رسالت  
دل و دماغ میں اتر گیا۔ قلب و نظر کو سکون کی منزل مل گئی۔ سارا اضطراب  
یہ تھا کہ بغیر پہچانے ہوئے مانیں کیسے؟ اور بغیر سمجھے ہوئے ایمان  
لائیں کیسے؟ پھر اگر سمجھنا بھی چاہیں تو چھوٹے سے آئینہ میں اتنی  
بڑی تصویر بنائیں کیسے؟ ناچینہ دل میں محتارِ کل کا جلوہ نظر  
آئے کیسے؟ ایک مرتبہ دل نے آواز دی۔ خبردار گھبرانا نہیں  
— رسالت کو پہچاننا ہے تو رسول ہی سے درسِ معرفت حاصل  
کرو اور ان کی بارگاہ میں وہی طریقہٴ عجز و نیاز اختیار کرو جو انہوں نے  
مالک کی بارگاہ میں اختیار کیا ہے۔ کل انہوں نے رب العالمین کی بارگاہ  
میں عرض کیا تھا۔ مالک! جو حقِ معرفت تھا ویسے نہ پہچان سکا۔  
آج تم ان کی بارگاہ میں عرض کرو، سرکار! اپنا کلِ عرفان یہی ہے کہ ہم  
آپ کے عرفان سے عاجز ہیں۔ اور وہ حقِ معرفت نہیں ادا کر سکے  
جو غلامی کا فرض تھا۔ لیکن میرے سرکار دل مطمئن ہے کہ اتنا تو سمجھ لیا  
کہ آپ ہماری فکر و نظر سے بالاتر ہیں۔ آپ کی منزلِ عرشِ اعظم  
ہے، ذہنِ بشر نہیں۔ ہمارے ذہنوں میں ایک جھلک بھی آجاتے تو  
ہماری نجات کے لیے کافی ہے۔ ہم وہ انسان نہیں ہیں کہ کچھ نہ پہچانتے  
کے بعد بھی اپنے کو عارفِ کامل ہی سمجھتے رہے اور زندگی بھر رسالت کا

یقین نہ کرنے کے باوجود اپنے کو مسلم اول ہی تصور کرتے رہے۔  
 خدا گواہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں شک نے راہ نہیں پائی۔  
 ہمارے دل و دماغ میں یقین کے علاوہ کسی نے جگہ نہیں لی۔ ہماری  
 زندگی آپ کی محبت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم نے محبت کا وہ راستہ  
 اختیار کیا ہے جہاں محبوب کی ہر محبوب شے محبوب ہوتی ہے اور اس کی  
 کراہت باعث نفرت بن جاتی ہے۔ اسی لیے ہم نے آپ کے اہلبیتؑ  
 سے زندگی کے ہر موڑ پر محبت کی اور آپ سے الگ ہو جانے والوں کو کبھی  
 محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔

عزیزانِ محترم! یاد رکھیے کسی چیز کی معرفت کے چند وسائل ہوا  
 کرتے ہیں، یا تو انسان نے اسے خود بنایا ہو کہ اس کے ایک ایک جزو  
 اور ایک ایک گوشے سے باخبر ہو، یا کم از کم اس کی نگاہوں کے سامنے  
 بنا ہو کہ تمام پہلوؤں کو دیکھ بھال لیا ہو۔ اور اگر یہ کچھ نہیں ہے تو کم از کم  
 خود بھی اسی درجہ پر فائز ہو کہ یہ جانتا ہو کہ یہ درجہ کیا ہے۔ اور اس منزل  
 پر فائز ہونے والا کیسا ہوتا ہے۔

سرکارِ دو عالمؐ کی ہستی کا عرفان اس لیے بھی مشکل ہے کہ انھیں ہم  
 نے رسول بنایا نہیں اور نہ بتانے والے نے ہماری نگاہوں کے سامنے  
 رسالت دی ہے اور اس سے بالاتر یہ ہے کہ ہم خود صاحبِ رسالت  
 بھی نہیں ہیں کہ یہ پہچان سکیں کہ رسالت کیا ہے اور رسول کیسا ہوتا ہے۔  
 ایک بچہ ہمارے سامنے آکر یہ خبر دیتا ہے کہ ہم نے بی۔ اے پاس

کر لیا۔ تو ہم خوش ہو جاتے ہیں۔ انعام دیتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں یہ خیر بھی نہیں ہے کہ نبی۔ اے کیا ہوتا ہے اور نبی۔ اے کا درجہ کتنا بلند ہے۔

ہم کسی بڑے عالم و خطیب و مقرر کی مجلس میں بیٹھے ہیں اور جب کوئی بات پسند آتی ہے تو سبحان اللہ بھی کہتے ہیں لیکن کیا اس سبحان اللہ کا مقصد یہ ہے کہ ہم نکتہ کی ان تمام گہرائیوں تک پہنچ گئے جہاں تک ایک عالم کا ذہن پہنچا ہے۔ ہرگز نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم بیساختہ تعریف کرتے ہیں اور وجد میں جھومنے لگتے ہیں۔

یہ سب عرفان کے وہی فطری طریقے ہیں جن کی طرف سرکارِ دو عالم نے اشارہ کیا تھا کہ تعریف اس بات کی نہیں ہے کہ آپ نے بی۔ اے پاس کر لیا۔ تعریف اس بات کی ہے کہ آپ نے وہ درجہ پایا جو ہمیں نہیں ملا۔ تعریف اس کی نہیں ہے کہ ہم نے نکتہ سمجھ لیا۔ تعریف اس کی ہے کہ آپ نے وہ کچھ بیان کیا جس کی گہرائیوں تک ہمارا ذہن نہیں پہنچا، ورنہ اگر پوری بات پہلے سے ذہن میں ہوتی تو ہم کبھی سبحان اللہ نہ کہتے۔ کبھی تحسین و آفرین کی آوازیں بلند نہ کرتے۔

پہچانا آپ نے۔ معرفت کی منزل کتنی سخت ہوتی ہے اور عرفان کے لیے کیا اہم شرائط درکار ہوتے ہیں۔ جب ہم اپنی محفل کے ایک درجہ کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اپنی ہی بزم کے ایک نکتہ کا ادراک نہیں کر سکتے تو ہمیں رسالت کا عرفان کیونکر ہوگا۔؟ ہم رسول

تو نہیں ہیں۔ ہمارے سامنے رسالت تو تقسیم نہیں ہوئی۔ رسول کو پہچانتا ہے تو اس کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ اس خدا سے دریافت کر دجس نے رسول بنایا ہے۔ اس شریک نور سے پوچھو جس کی نگاہوں کے سامنے رسالت ملی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی مکمل تعارف نہیں کر سکتا۔ اسی لیے سرکارِ دو عالم نے فرمایا تھا کہ :

”خدا کو میرے اور علیؑ کے علاوہ کسی نے نہیں پہچانا اور مجھے علیؑ اور خدا کے علاوہ کسی نے نہیں پہچانا۔“

عرفان کی یہ وہ بلند منزل ہے جہاں ذہنوں کا گذر نہیں۔ دماغ پہنچ نہیں سکتے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ جس نبی کا وصی یہ اعلان کرتا ہے کہ میری بلند یوں تک کسی کے طائرِ فکر کی رسائی نہیں ہے۔ اُس نبی کی منزل تک کون پہنچے گا۔ جس کی جوتیاں ساتوں آسمانوں کو روند آئی ہوں اس کی منزلِ کمال کا اندازہ کون کرے گا۔ جس کی عظمتوں کے سامنے کائنات کا سرخم ہو اس کی بلندی کا اندازہ کون کرے گا۔ دنیا مبالغہ اور غلو نہ سمجھے تو میں یہاں تک عرض کروں کہ جلالتِ منزل کی منزل میں ہم ہی نہیں انبیاء و مرسلین بھی عاجز نظر آتے ہیں۔ انسانی دنیا میں عاجز آنے کے بعد میں نے انبیاء و مرسلین کی محفل میں قدم رکھا۔ ان سے پوچھوں میرے رسول کی منزل کیا ہے اور حبیبِ الہی کی جلالتِ قدر کیا ہے ؟

حضرت عیسیٰؑ سے پوچھا۔ آپ کا زمانہ قریب تر ہے آپ فرمائیں

اس رسول کا درجہ کیا ہے؟ عیسیٰ نے آواز دی۔ میری حیثیت تو صرف ایک بشارت دینے والے کی ہے، میں کیا بتاؤں کہ اس کا مرتبہ کیا ہے۔  
حضرت موسیٰ سے پوچھا، آپ فرمائیں، اس رسول کی عظمتیں کیا ہیں؟  
آواز آئی میری منزل کوہ طور ہے اور اس کا درجہ منزل نور — میں کیا بتاؤں کہ اس کا مرتبہ کیا ہے۔

آگے بڑھ کر حضرت ابراہیم سے پوچھا۔ خلیلِ خدا! آپ بتائیں آپ کے اس پوتے کا مرتبہ کیا ہے۔؟ خلیل نے آواز دی۔ میں کیا بتاؤں یہ میری خلقت سے ہزاروں سال پہلے پیدا ہوا ہے میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ اس کا نور میرے صلب میں نہ ہوتا تو نارِ نمرود سے نجات نہ ملتی۔  
حضرت لوط سے پوچھا۔ اُمحوں نے فرمایا، یہی تو وہ ہے جس کی وجہ سے کشتی کو قرار ملا۔

حضرت آدم سے سوال کیا۔ اے نبیِ خدا! آپ تو ابوالبشر ہیں آپ فرمائیے، آپ کے فرزند کی منزلِ رسالت کیا ہے۔؟ آواز آئی میں ابوالبشر ہوں سید الانبیاء نہیں ہوں۔ میں تو اُس وقت آب و گل کے درمیان تھا جب یہ منزلِ نبوت پر فائز ہو چکا تھا میں کیا بتاؤں کہ اس کی منزلِ نبوت کیا ہے۔؟

جب انبیاء و مسلمین کی محفل سے بھی محسوس ہو گیا اور کوئی جواب نہ ملا۔ تو آیا مشکل کشا کے دروازے پر۔ اے مشکل کشاے دو جہاں۔! آپ نے سب کی مشکل حل کی ہے میں بھی ایک عقدہ لیکر

آیا ہوں، اسے حل کر دیجیے۔ فرمایا، وہ کیا۔؟ میں نے دستِ ادب جوڑے اور عرض کی، آپ فرمائیں، اس آخری نبی کا مرتبہ کیسا ہے؟ — آواز آئی، بس یہ پہچانو کہ میں اس کا وصی اور تابع فرمان ہوں۔ تو جس کا وصی اتنا بلند ہوگا اس کا نبی کیسا ہوگا۔؟ تم انبیاء و مرسلین سے کیا پوچھتے ہو۔ ابھی وہ وصی نبی کی منزل تک نہیں پہنچے۔ تو نبی کی منزل کیا بتائیں گے۔

پہچانا آپ نے علیؑ کا مرتبہ۔؟ اب مجھے کہنے دیجیے کہ جب انبیاء و مرسلین، علیؑ کے عرفان و ایمان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، تو اُمت کے گنہگاروں کو یہ جو صلہ کہاں سے پیدا ہو گیا کہ وہ علیؑ کے ایمان و کردار کا مقابلہ کریں۔

علیؑ تو علیؑ — وہ تو صاحبِ منصب ہیں۔ وصی نبی ہیں۔ امامِ وقت ہیں۔ امیر المؤمنین ہیں۔ صاحبِ امر ہیں۔ ساقیِ کوثر ہیں۔ میںُ عندہُ علمِ الکتاب ہیں۔ فاتحِ خندق و خیبر ہیں۔ — مجاہدِ بدر و احد ہیں۔ مولودِ کعبہ ہیں۔

انبیاء و مرسلین علیؑ کی زوجہ کے مقابلہ میں نہیں لائے جاسکتے — میں کہتا تو دنیا کفر کا فتویٰ لگا دیتی، لیکن کیا کروں۔ خدا کا رسولؐ کہہ رہا ہے ”اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹی فاطمہؑ کا کوئی ہمسر نہ ہوتا۔ آدمؑ ہوں یا کوئی اور۔“

آدمؑ وغیر آدمؑ کی وسعت دیکھیے اور پھر سیدہؑ کی عظمت کا اندازہ

لگائیے۔ پوری کائنات میں کوئی ایسا نہیں ہے جو عظمتِ زہرا کا مقابلہ کر سکے۔ تو اے اربابِ کرم! ذرا غور کرو جس کی زوجہ ساری دنیا سے افضل و برتر ہو وہ شوہر کتنا بلند ہوگا۔ زوجہ پھر زوجہ ہوتی ہے اور شوہر پھر شوہر ہوتا ہے۔ اور وہ بھی کیسی زوجہ اور کیسا شوہر۔ یہ رشتہ وہ نہیں ہے جسے ہم نے اور آپ نے بغیر سوچے سمجھے کسی غرض سے قائم کر دیا ہو۔ یہ وہ رشتہ ہے جسے عرشِ اعظم پر دیکھ بھال کر رب العالمین نے قائم کیا ہے۔ اب فاطمہ دنیاوی رشتہ سے زوجہ علی نہیں ہیں، بلکہ خدائی رشتہ سے ہیں۔ اور علی دنیاوی اعتبار سے شوہر زہرا نہیں ہیں بلکہ مالک کے اہتمام سے ہیں۔

اہلِ دنیا سوچ سکیں تو سوچیں کہ کائنات میں کوئی اس شان کی زوجہ اور اس شان کا شوہر پیدا ہوا ہے یا نہیں۔ اور اگر نہیں ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس گھر میں زوجہ بھی بے مثال ہے اور شوہر بھی بے نظیر۔

ظاہر ہے کہ اس بے مثل و بے نظیر رشتے سے جو نسلِ عالمِ ظہور میں آئے گی وہ کسی بلند و بالا ہوگی۔

شاید یہی وجہ تھی کہ قدرت نے فاطمہ کو اولاد بھی لا جواب دی۔ نہ ہمت میں حسین جیسا کوئی پیدا ہوا۔ نہ خلقت میں حسن جیسا، نہ حوصلہ میں زینب جیسا کوئی نظر آیا، نہ عزم میں ام کلثوم جیسا۔ ہر فرد ہر اعتبار سے کامل و مکمل۔

اب مجھے کہنے دیجیے کہ عظمتوں نے ساری کائنات کا چکر لگانے کے بعد آخر میں زہرا کی ڈیڑھی پر ڈیرے ڈال دیے اور اب صبحِ قیامت تک یہ خیمہ فضیلت اکھڑنے والا نہیں ہے۔ دنیا مٹتی ہے تو میٹ جائے لیکن در زہرا کی عظمت بہ حال ”قائم“ رہے گی۔

بات کو آخری منزل تک پہنچانے سے پہلے ایک نکتہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اسلام میں معرفت پر اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے۔؟ خدا کی معرفت۔ نبی کی معرفت۔ امام کی معرفت۔ اور ہر معرفت کی انتہائی تاکید۔ حد ہوگی کہ مولا کے کائنات نے یہاں تک فرمایا کہ: ”أَوَّلُ الدِّينِ مَعْرِفَتُهُ“ (دین کی ابتدا اُس کی (اللہ کی) معرفت ہے) (بیچ ابلاغِ خطبہ)

دین کی ابتدا ہی معرفت سے ہوتی ہے۔ معرفت نہیں تو گو یا دین ہی نہیں۔ معرفت نہیں تو مذہب ہی نہیں۔

بات صرف یہ ہے کہ انسان کا کردار اُس کی معرفت ہی کے سانچے میں ڈھلا کرتا ہے۔ جیسا عرفان ہوگا ویسا ہی کردار بھی ہوگا۔ ایک انسان کے بارے میں آپ طے کر لیں کہ یہ حقیر فقیر ہے تو نہ کبھی اس کی تعظیم کریں گے، نہ اس سے مرعوب ہوں گے اور نہ اسے خاطر میں لائیں گے۔ لیکن ایک آدمی کے بارے میں اگر یہ فیصلہ کر لیں کہ یہ صاحبِ عظمت و جلال ہے تو خواہ مخواہ اس کی تعظیم بھی کریں گے۔ اس کی بات پر عمل بھی کریں گے۔ بے توجہی میں کردار مشکوک رہتا ہے اور انسان کا ضمیر مطمئن نہیں ہوتا۔

یہ انسان قابلِ تعظیم ہے یا لائقِ تذلیل — اس کی بات پر عمل ہونا چاہیے، یا نہیں۔ لیکن معرفت کے بعد یہ شبہات خود بخود دل سے نکل جاتے ہیں اور ضمیر کو ایک طرح کا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کردار سازی بھی انتہائی آسان ہو جاتی ہے۔

اسلام کا منشا بھی یہی تھا کہ ہمارے دائرہ میں قدم رکھنے والا، بلا معرفت قدم نہ رکھے۔ آئے تو مکمل معرفت لے کر آئے تاکہ عمل کی منزل میں ہمیں تاکید نہ کرنا پڑے، بلکہ اس کا عرفان خود اسے عمل پر آمادہ کرے۔ یہی تو راستہ ہے کہ جن لوگوں کو عرفانِ رسول حاصل تھا وہ اپنی زندگی کی ایک ایک حالت کو مرضی رسول کے سانچے میں ڈھالے ہوئے تھے اٹھیں تو مرضی رسول دیکھ کر، بیٹھیں تو مرضی رسول پہچان کر۔ جیسے تو رسول کی راہ میں اور مریں تو رسول کی راہ میں۔

تفصیلی بیان کا وقت نہیں ہے ورنہ ایسی بیشمار مثالیں پیش کی جاسکتی تھیں جہاں عظمتِ کردار اور بلندیِ عرفان کے یہ نمونے نظر آتے لیکن یہاں تو صرف ایک منزل کی طرف اشارہ کرنا ہے جہاں کمالِ عرفان کا عالم یہ ہے کہ پچھرا ہوا شیر قبضہ شمشیر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اب مولا کی مرضی نہیں ہے۔

عباس علیہ السلام اگر صرف سپاہی ہوتے اور صاحبِ عرفان نہ ہوتے تو کربلا کی جنگ تیسری محرم کو ختم ہو جاتی، لیکن یہ معرفت ہی کا معجزہ تھا کہ فرات سے خیمے ہٹ گئے اور غازی کی پیشانی پر بل نہیں آئے جب

میرے مولا کی یہی مرضی ہے تو میں کون بولنے والا — !  
 تاریخِ کربلا میں بیشمار مواقع آئے ہیں جہاں عباسؑ نے اپنے کمالِ  
 عرفان کا ثبوت دیا ہے اور دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ معرفت سے ہٹ کر  
 بہادری اور ہوتی ہے اور معرفت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی شجاعت اور  
 — بے معرفت جنگ کیا کرتے ہیں اور اہل معرفت جہاد —  
 جنگ و جہاد کے اس فرق نے کربلا کے سمجھنے کا راستہ کھول دیا کہ ادھر  
 طاقت کے بھروسے پر جنگ ہو رہی تھی اور ادھر عرفان کے اعتماد پر جہاد  
 یہی وجہ تھی کہ ادھر کا کوئی ایک بھی فرد ادھر نہیں گیا۔ لیکن ادھر کا حسرتِ معرفت  
 حاصل ہوتے ہی تڑپ کر حسینؑ کی خدمت میں آگیا۔ ادھر کا زہیر کھنچ کر  
 مولا کی بارگاہ میں آگیا اور لوں آگیا کہ شبِ عاشور عباسؑ جیسے وفادار  
 سے زہیر نے کہہ دیا۔ فرزندِ علیؑ! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بابا نے آپ کو  
 کس دن کے لیے مہیا کیا تھا۔

یہ سننا تھا کہ ایک مرتبہ شیر کو جلال آیا۔ غیرتِ ہاشمی خون بن کر رگوں  
 میں دوڑنے لگی۔ پشتِ فرس پر انگریزی لئی۔ رکابیں ٹوٹ گئیں۔  
 فرمایا: زہیر! آج کیا شجاعت کا جوش دلاتے ہو۔ ذرا اس رات کی  
 صبح تو سونے دو پھر دیکھنا، عباسؑ کیا ہے اور عباسؑ کی وفا کیا ہے۔ ؟  
 لیکن عزادارو! یہ جذبہ دل کا دل ہی میں رہ گیا اور مشکِ سینہ  
 کی ذمہ داریوں نے غازی کو جنگ نہ کرنے دی۔ عباسؑ کی تلوار نکلتی تو دنیا  
 خیر کی جنگ کا نقشہ دکھتی۔ مگر وہ غازی کیا کرے جس کے ہاتھوں میں

ذوالفقارِ حیدری کے بجائے مشکِ سکینہ ہو اور نظر کے سامنے فوجِ دشمن کے بجائے بھتیجی کی معصوم صورت ہو جو بار بار کہہ رہی ہو۔ چچا جنگ کا موقع نہیں ہے۔ چچا لڑائی میں دیر مت کیجئے گا۔ چچا آپ کی بھتیجی بہت پیاسی ہے۔ اب گلے سے آواز نہیں نکلتی۔ زبان اینٹھ گئی ہے۔ ہونٹ خشک ہو گئے ہیں۔ اور عباسؑ جب اس منظر کا تصور کر لیتے ہیں تو کلیجہ پانی ہو جاتا ہے۔

ساتی کوثر کا فرزند زندہ رہے اور مولا کی لاڈلی پیاس سے بے جان ہو جائے۔ عباسؑ اس زندگی سے کیا فائدہ۔ بڑھو۔ جلدی بڑھو۔ سکینہ کے شکوہ سے پہلے پانی خیامِ حسینی میں پہنچ جائے۔ علمدار نے مولا کو سلام کیا۔ اجازت لی۔ مشک و علم کو سنبھالا۔ میدان کا رخ کیا۔ گھوڑا دوڑاتے ہوئے فرات پہنچے۔ مشکیزہ کو بھرا۔ چلو میں پانی لیا۔ پانی میں حسرتوں کی تصویر نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سکینہ سامنے کھڑی ہوئی کہہ رہی ہے۔ چچا جلدی چلیے۔ تھے خیمہ میں پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ چچا دیکھیے! یہ آپ کی سکینہ بھی پیاسی ہے۔ چچا! میرا بھیا جھولے میں پیاس سے تڑپ رہا ہے۔ عباسؑ نے پانی کو پھینکا، ہاتھ کو دامن سے خشک کیا۔ وفانے آواز دی۔ عباسؑ! کہیں سکینہ تیرے ہاتھوں کی تری نہ دیکھ لے۔ بھتیجی کو شکوہ ہو گا چچا کے ہاتھ میں پانی کی تری کیسے آئی۔ گھوڑے کا رخ موڑا۔ اب شیر ترائی سے بلندی کی طرف آ رہا ہے۔ چار ہزار کا پہرہ اور اس میں ایک علمدار۔

کوئی تلوار لیب کر بڑھا، کسی نے نیزہ سنبھالا، کسی طرف سے تیروں کی بارش شروع ہوئی۔ اور علیؑ کا شیر نہایت اطمینان سے صفوں کو چیر کر باہر نکل آیا۔ گھوڑے کو دوڑایا۔ کیسے خمیہ تک پہنچ جاؤں۔ ایک مرتبہ ایک ظالم نے چھپ کر وار کیا۔ ایک ہاتھ قلم ہو گیا۔ علم کو دوسرے ہاتھ سے سنبھالا۔ گھوڑے کو اور تیز کیا۔ راستے میں دوسرا شانہ بھی قلم ہو گیا۔ عباسؑ نے پرواہ نہ کی۔ تیزی سے خمیہ کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں، لیکن اولاد والو! ایک مرتبہ ایک تیر مشکیزہ پر آکر رگ اُدھر پانی بہا۔ اُدھر خون پانی ہو گیا۔ شرم سے سر جھکا لیا۔ ہائے سکینہ کو کیا جواب دوں گا۔ بچی کو کیسے منہ دکھاؤں گا۔ مولا کی لاڈلی نے مجھ سے پانی کا سوال کیا اور میں پورا نہ کر سکا۔

سر کا جھکنا تھا کہ ایک ظالم نے گزرا ہمنی مارا۔ مسجد کو فر کی تاریخ دہرائی گئی۔ عباسؑ کا سر شگافتہ ہو گیا۔ خون کا قوارہ جاری ہوا۔ گھوڑے کی طرف رخ کر کے کہا: اے اسپ با وفا پلٹ چل۔ اب عباسؑ خمیہ میں جانے کے لائق نہیں رہا۔ اب سکینہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ فرات کی طرف بڑھے۔ چند قدم چلے تھے کہ طاقت نے ساتھ چھوڑ دیا۔ گھوڑے سے زمین کی طرف چلے۔

اربابِ عزا! مجھ میں بہت نہیں کہ لفظوں میں دہرا سکوں۔ آپ سوچ سکیں تو سوچیں۔ یہ گھوڑے سے کون گر رہا ہے۔ وہ۔ جس کے ہاتھ نہیں ہیں۔ جس کے شانے قلم ہو چکے ہیں۔ جس کا سر گز سے زخمی ہے

دل چاہتا ہے، آواز دوں۔ یا علیٰ ! نجف سے آئیے۔ عباسؑ کو سہارا  
دیجیے۔ آپ کے لال کے ہاتھ نہیں ہیں کہ زمین پر ٹیک سکے۔ آپ  
کے فرزند کا سر نہ جھی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ کس نے سہارا دیا اور عباسؑ کس طرح زمین تک  
پہنچے۔ بس حسین کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ مولا آئیے۔ آواز کانوں سے  
ٹکرائی اور ہاتھ کمر تک پہنچ گئے۔ عباسؑ ! اس آواز نے کمر ٹوڑی  
۔ بھیا۔ ! حسین اکیلا رہ گیا۔ میرے علمدار ! اب دشمن  
طفے دے رہے ہیں حسین ! تمہارا علمدار کہاں ہے۔ ؟ عباسؑ !  
بتاؤ میں کیا جواب دوں ؟

حسین دل ہی دل میں بین کرتے رہے۔ ایک مرتبہ اٹھے۔ کمر  
کو کس کے باندھا۔ میدان کا رخ کیا۔ گرتے پڑتے چلے۔ راستے میں کوئی  
چیز اٹھا کر سینے سے لگاتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ  
سر ہانے پہنچے۔ سر زانو پر رکھا۔

عزادارو !۔ بتاؤ کیسا سر۔ وہ سر جس پر گرز لگ چکا ہے  
۔ وہ سر جو دو پارہ ہو چکا ہے۔ وہ سر جس سے خون کا فوارہ جاری  
ہے۔ کیسے حسین نے زانو پر رکھا، اور کیسے اس منظر کو دیکھا۔ ؟ اسے  
فرزند زہرا کا دل ہی جانتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عباسؑ نے سر ہٹا لیا۔ اللہ غلام کا سر اور آقا کا  
زانو۔ مولا دیکھیں گے تو بیچین ہو جائیں گے۔ شاید اشارہ ہو کہ آقا میرا سر

آپ کے زانو پر ہے، آپ کا سر کس کے زانو پر ہوگا۔؟ مظلومیت نے آواز دی۔ عباس! گھبراؤ نہیں جب جیسٹ گھوڑے سے گریں گے تو دکھیا مال آئے گی اور اپنے لال کا سر اپنے آغوش میں لے لیگی۔

عزادارو! مجلس تمام ہو رہی ہے۔ بھائی بھائی میں گفتگو جاری ہے عباس وصیتیں کر رہے ہیں۔ مولا میرے لاشے کو خیمے تک نہ لے جائیے گا۔ بھیا۔! کیوں؟۔ اقا! مجھے سکیٹھ سے شرم آتی ہے۔ میں نے بچی سے پانی کا وعدہ کیا تھا، لیکن پورا نہ کر سکا۔

میں کہوں گا عباس! آپ نے حد و وفا کا ثبوت دیا۔ اب یہ بچوں کا مقدر ہے۔ میرے شیر شرم کی کیا بات ہے۔ جائیے کم از کم بھتیجی آپ کی وفاداری کو دیکھ لو۔

لیکن عزادارو! شاید عباس کا مقصد یہ بھی ہو کہ آقا ۳ سال کے جوان کا لاشہ ہے اور آپ کی ٹوٹی ہوئی کمر۔ یہ لاشہ کیسے اٹھے گا؟ مولا! مجھے فرات کے کنارے سجا رہنے دیجیے۔

وصیت تمام ہوئی۔ عباس بائیں کرتے کرتے چپ ہوئے اور حسین کی زبان پر مرثیہ آگیا۔

عباس! آج سے وہ آنکھیں چین سے سوئیں گی جو تیرے خوت سے جاگا کرتی تھیں، اور بھیا! اب تیری بہنیں جاگیں گی، انھیں سونالضیب نہ ہوگا۔ عباس! اب تیری سکیٹھ بھی نہ سو سکے گی۔

ہائے وہ شامِ غربیاں کا سناٹا۔ وہ زینب کا پہرہ۔ اور وہ

سکینہ کی بیتابی — چچا، تم کہاں ہو — ظالموں کے نرغہ میں اچھے  
مجھے کیسے نیند آئے گی — میں سوؤں گی تو کوئی مجھے سونے نہ دے گا۔  
میں آرام کروں گی تو ظالم مجھے جگادیں گے۔ اور میں رونا بھی چاہوں گی  
تو شرمیلوں تازیانوں سے اذیت دے گا۔

عزیرو! جو سکینہ نے سوچا تھا وہی ہوا — شام غریباں  
کے سنائے میں جب بابا کو آواز دیتی مقتل میں آئی اور باپ کے لاشہ  
بے سر سے لپٹ کر رونا شروع کیا تو اشقیاء تازیانے لے کر آگے بڑھے  
اور چاروں طرف سے بچی کی پشت پر تازیانوں پر تازیانے پڑنے لگے۔  
بچی فریاد کرتے لگی چچا آپ کے نہ ہونے سے آپ کی سکینہ تازیانوں پر  
تازیانے کھا رہی ہے۔

” اَنَا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ • “

(۱۰)

أَخُذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ  
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ .  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ . وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ  
 عَلَى أَفْضَلِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ . سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا  
 أَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ  
 وَلَعْنَةُ اللَّهِ الدَّائِمَةُ الْبَاقِيَةُ عَلَى أَعْدَائِهِمْ  
 أَجْمَعِينَ مِنَ الْآنِ إِلَى قِيَامِ يَوْمِ الدِّينِ  
 أَمَا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ .  
 ” وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ “

” اور محمد صرف اللہ کے رسول ہیں۔“  
 قرآن حکیم کے اس فقرہ کی روشنی میں آج یہ واضح کرنا ہے کہ رسالت  
 کیا ہے اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔؟

مالکِ کائنات نے انبیاء و مرسلین کا سلسلہ کیوں قائم کیا، اور  
 انبیاء و مرسلین نے کن ذمہ داریوں کو کس طرح ادا کیا، اور پھر ان تمام نمائندگانِ

کے درمیان حضور سرور کائنات کی منزل اور آپ کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور آپ نے ان ذمہ داریوں کو کس طرح ادا کیا۔

ابتدائی طور پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ رسالت کی ضرورت کیا ہے اور اس بگڑی ہوئی دنیا میں اللہ کی طرف سے نمائندوں کے آنے کا مقصد کیا ہے۔ تاریخ انسانیت اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی کوئی نمائندہ الہی آیا اور اس نے دنیا کی اصلاح کی کوشش کی تو اہل دنیا نے اسے اس قدر ستایا کہ اکثر اوقات بارگاہِ احدیت میں فریاد کی اور کبھی کبھی بددعا کے لیے ہاتھ اٹھادیے۔ حضرت آدم کو بیٹے کا داغ اٹھانا پڑا۔ حضرت نوح کو پتھر کھانا پڑے۔ حضرت ابراہیم کو آتشِ نمرود میں جانا پڑا۔ حضرت موسیٰ کو غریب الوطنی کی زندگی گزارنا پڑی۔ حضرت عیسیٰ کو ساتھیوں کی بے مہری سے سابقہ پڑا۔ خود حضور سرور کائنات کبھی پتھر کھاتے رہے، کبھی کانٹوں پر چلتے رہے، کبھی سر پر کوڑا کرکٹ برداشت کرتے رہے اور اسی طرح ۲۳ سال تبلیغ کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

سوال صرف یہ ہے کہ ایسے حالات میں کیا ضروری تھا کہ پروردگار عالم انبیاء و مرسلین کو بھیجتا ہی رہتا اور اہل ستم کے لیے برابر ایک نشانہ ستم فراہم ہی ہوتا رہتا۔ ایک دو دور میں اہل زمانہ کی روش دیکھنے کے بعد یہ سلسلہ ختم کر دیا جاتا۔ دنیا راہِ راست پر آتی یا نہ آتی، کم از کم اللہ والے تو ان منظم سے محفوظ رہ جاتے اور انھیں تو ستم روزگار کا نشانہ نہ بننا پڑتا۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ مصلحتِ الہی کو رب العالمین ہی بہتر جانتا ہے لیکن ایک نکتہ پر

ہیں اور آپ کو بھی توجہ دینا ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی انسان کسی شخص کو اپنے گھر مدعو کرے اور دسترخوان پر مختلف قسم کے سامان چُن دے۔ ان میں کھانے کا سامان بھی ہو اور ہاتھ دھونے کا پانی بھی۔ لذیذ غذا میں بھی ہوں اور ماکھیوں کو مارنے کی دوا بھی۔ خود گھر میں بیٹھنے کی جگہ بھی ہو اور صاف شفاف بیت الخلاء بھی۔ تو میزبان کا اخلاقی فرض ہے کہ مہمان کو گھر کی پولیشن سے باخبر کر دے اور اسے یہ بتا دے کہ رہنے کی جگہ کون سی ہے اور سونے کی جگہ کون سی۔ ملاقات کا کمرہ کون سا ہے اور بیت الخلاء کون سا۔ نہانے کی جگہ کہاں ہے اور ہاتھ دھونے کی جگہ کہاں۔ غسل کرنے کا حوض کون سا ہے اور منہ ہاتھ دھونے کا حوض کون سا۔ دسترخوان پر کھانے کا سامان کیا ہے اور نمائش کا سامان کیا۔ غذا کون سی ہے اور مکھی مارنے کی دوا کونسی۔

ایسا نہ کرنے سے اگر مہمان سے کوئی غلطی ہوگئی اور اس نے مکان کو گندہ کر دیا۔ یا زہریلی دوا کھا کر مر گیا تو اس کی موت کی ذمہ داری خود اس پر عائد نہ ہوگی، بلکہ اس کا خون ناحق اس میزبان کے سر پر ہوگا جس نے دعوت میں بلایا اور حالات سے باخبر نہیں کیا۔

یہ تو وہاں کے حالات ہیں جہاں مہمان خود بھی دنیا کا تجربہ رکھتا ہے اور مختلف چیزوں کو پہچانتا ہے۔ صرف مقامی سامان یا مقامی رسم و رواج سے باخبر نہیں ہے۔ لیکن اگر مہمان کسی بات سے باخبر نہ ہو اور وہ مطلق طور پر ناواقف ہو تو میزبان کی اخلاقی ذمہ داری کہیں زیادہ بڑھ

جاتی ہے اور اخلاقی دنیا میں مہمان کی موت میزبان کی طرف سے اقدامِ قتل کا درجہ پیدا کر لیتی ہے۔

عبد و معبود، خالق و مخلوق اور خدا و بندہ کا رشتہ یہی ہے۔ مالکِ کائنات نے انسان کو عدم سے نکال کر وجود کی بستی میں پہنچایا۔ بستی وہ جہاں اچھی بُری، مضر اور مفید، قابلِ استعمال اور ناقابلِ استعمال اشیاء کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ زمین سے آسمان تک مخلوقات کا ایک سلسلہ ہے۔ ہوا سے لیکر فضا تک کارآمد چیزوں کا ایک تسلسل ہے اور مہمان ایسا ناواقف کہ اسے خود اپنی بھی خبر نہیں ہے۔ کوئی نام رکھ دے تو اپنے نام سے باخبر ہو جائے ورنہ اپنا نام بھی نہیں جانتا۔ کوئی غذا دیدے تو کھلے، ورنہ اپنی زندگی کا بھی انتظام نہیں کر سکتا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ میرا بستر کہاں ہے اور دسترخوان کہاں ہے۔ فطرت نے اس حد تک راہنمائی کی ہے کہ تیری ماں تیری پوری دنیا ہے۔ اسی کا سینہ تیرا دسترخوان ہے۔ اور اسی کی گود تیرا بستر۔ اسی کا وجود تیرے آرام کی جگہ ہے اور اسی کا وجود تیرے ضروریات زندگی کی منزل لیکن ایک وہ منزل بھی آتی ہے جب انسان اس مکان سے منتقل ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس کی دنیا آغوشِ مادر سے پھیل کر سینہ گیتی تک پہنچ جاتی ہے اس کا وجود صرف ماں سے متعلق نہیں ہے۔ اب اس کی دنیا صرف سینہ و آغوشِ مادر نہیں ہے بلکہ لطنِ گیتی اور سینہٴ زمین ہے۔

غنیمت ہے کہ ضروریات کے ساتھ شعور نے باقاعدہ ترقی نہیں کی

اور تجھ اپنے ضروریات میں ماں باپ اور تربیت کرنے والوں کا محتاج رہا اور اُنہوں نے اُسے نیک و بد سے آگاہ کرنے کے ساتھ دونوں کے ساتھ برتاؤ کا طریقہ بھی سکھا دیا۔ لیکن یہ سلسلہ بھی کب تک ہے؟

دھیرے دھیرے شعور نے ترقی کی۔ عقل پختہ ہوئی۔ ادراک کو کمال حاصل ہوا۔ اور ضروریاتِ زندگی نے خود مختاری کی دعوت دی۔ بچہ صحنِ خانہ سے نکل کر میدانِ دنیا تک پہنچا۔ حالات نے ایک خاندان کے افراد کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا۔ اور ذہن نے مضطرب ہو کر فریاد کی۔ اب کون بتائے کہ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے۔ اب کون سکھائے کہ کیا کھاؤں اور کیا نہ کھاؤں۔ اب کون سمجھائے کہ کہاں رہوں اور کہاں نہ رہوں۔ پیدا کرنے والے نے بندے کا اضطراب دیکھا۔ رحمت کو جوش آیا۔ اور ایک مرتبہ ندائے قدرت آئی۔ میرے بندے گھبرانا نہیں۔ جس نے کل سینہ و آغوشِ مادر کا پستہ بتایا تھا۔ جس نے کل صحنِ خانہ میں رینگنا سکھایا تھا۔ جس نے کل ماں باپ اور تربیت کرنے والوں کو جذبہٴ محبت و ہمدردی سے نوازا تھا۔ وہ آج بھی زندہ ہے اور تیرے حالات کو جانتا ہے اور تجھ پر رحم کرنے کے لیے تیار ہے۔ میرے بندے! اب تیری عقل کامل ہو گئی ہے۔ تیرا شعور پختہ ہو گیا ہے۔ اب تجھے محنت کرنا پڑے گی۔ نظامِ فطرتِ محنت و مشقت چاہتا ہے۔ وقارِ انسانیت کسب و طلب کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اب وہ دن گئے جب دوسروں

کے سہارے زندگی گزار رہا تھا۔ اب وہ وقت نہیں رہا جب تو والدین کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہا تھا۔ جب تیری عقل ناقص تھی، تیرا دماغ وسیلوں میں الجھ رہا تھا تو میں نے تجھے وسیلہ ہی کے حوالے کر دیا تھا۔ تیرے والدین کو اصول تربیت سکھائے اور تجھے اسی وسیلہ میں گم رہنے دیا۔ لیکن اب تو تیری عقل کامل ہو گئی ہے۔ اب تیرے شعور میں یہ بات آنے لگی ہے کہ وسیلہ اور ہے، اصل اور ہے۔ راستہ اور ہے، منزل اور ہے۔ والدین اور ہیں، رب العالمین اور ہے۔ اب تجھے زندگی کا سبق ہم سے لینا ہے غیر سے نہیں۔ اپنا رابطہ ہم سے قائم کرتا ہے، دنیا سے نہیں ہم نے تجھے نیک و بد سے آگاہ کرنے کے لیے اپنی طرف سے رسالت و نبوت کا سلسلہ قائم کر دیا ہے، تاکہ تو گمراہ بھی نہ ہونے پائے اور میرے دامن انصاف پر دھبتے بھی نہ آنے پائے۔ تو بھی راہِ راست پر لگ جئے اور میں بھی یہ کہہ سکوں کہ مہمان بلا یا ہے تو مہمان نوازی کا سارا انتظام بھی کر دیا ہے۔

یاد رکھیے! نبوت و رسالت اسی پیغامِ رسالتی کا نام ہے جہاں اللہ والے، اللہ کے مہمانوں کو اچھے برے سے یا خبر بناتے ہیں اور انسانوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ اس بھری پُری دنیا میں کون سی چیز قابلِ استعمال ہے اور کون سی چیز ناقابلِ استعمال۔ بندہ ان حقیقتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ اسے ان حالات کی مکمل خبر نہیں ہے۔ وہ اپنے ہی کو نہیں پہچانتا تو اپنے ضروریات کا کیا اندازہ کرے گا۔ یہ سہاری ذمہ داری ہے کہ ہم اسے راہ و چاہ سے باخبر کریں۔ ہم نے

انبیاء و مرسلین کو اسی لیے بھیجا ہے کہ وہ تمہیں راہِ راست پر لائیں اور اچھے  
بڑے سے آگاہ کریں۔

اب یہ تمہارا انصاف تھا کہ تم نے اپنے مہربان و مہر دار افراد کو بھی  
اپنے سماج میں جگہ نہیں دی اور انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے رہے  
ان کا ظرفِ اخلاق اتنا وسیع تھا کہ انہوں نے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کیں  
لیکن تمہارا ساتھ نہیں چھوڑا اور تمہیں سیدھے راستے پر لگانے کی کوشش  
کرتے رہے۔

اسی منزل سے یہ فیصلہ بھی آسان ہو جاتا ہے کہ نمائندہ الہی کو کیسا  
ہونا چاہیے۔ کہ اگر نیک و بد سے باخبر کرنے والا خود بے خبر ہو گا تو اُس  
کی بات بے اثر ہوگی اور اگر سیدھے راستے پر لگانے والا خود بہر کا ہوا  
ہو گا تو اُس کی نمائندگی ایک دھوکا ہوگی، ہدایت نہ ہوگی۔ مالک سے بہتر  
اس حقیقت سے کون باخبر ہوگا۔

اُس نے جتنے انبیاء و مرسلین بھیجے ہر ایک کو عالم بھی پیدا کیا اور معصوم  
بھی۔ اب جتنی اہم ذمہ داری ہوگی اتنی ہی زیادہ عصمت اور آگاہی ضروری  
ہوگی۔ جس کی ذمہ داری ایک زمانے۔ ایک دور۔ ایک خاندان  
۔ ایک قبیلہ سے متعلق ہوگی۔ اس کی منزلِ کمال بھی اتنی ہی بلند ہوگی اور جو  
ساری کائنات کا صبحِ قیامت تک کا ذمہ دار ہوگا۔ اس کی عظمتِ کردار  
اور بلندیِ منزل کا پتہ لگانے کے لیے عرش و فرش کی وسعتوں اور صبحِ قیامت  
تک کی ضرورتوں کا اندازہ لگانا پڑے گا۔ اور جب تک یہ وسعتیں

ذہن میں نہ آجائیں مقامِ محمدیت کا اندازہ ناممکن ہے۔

اس طرف کے بندے کہاں پیدا ہوں گے جو دنیا کی اصلاح کی خاطر اتنے مصائب کا سامنا کریں۔ اور امت کے سدھارنے کیلئے کانٹوں پر چلنا گوارا کریں۔ یہی طرف کی بلندی تھی جس نے کسی کو صافی اللہ بنا دیا تو کسی کو نجی اللہ۔ کسی کو خلیل اللہ بنایا، تو کسی کو ذبیح اللہ۔ کسی کو کلیم اللہ بنایا، تو کسی کو روح اللہ۔ اور جب سارے کمالات ایک منزل پر سمٹ کر آگئے تو حبیب اللہ کا درجہ دیدیا۔

عزیزانِ محترم۔ جب رسالت و نبوت نیک و بد سے آگاہ کرنے کا نام ہے تو جب تک اس کائنات میں انسان زندہ رہے گا اور نیک و بد کا شعور رہے گا، انبیاء و مرسلین کی ضرورت بھی رہے گی۔ لیکن نہ جانے کیا مصلحتِ الہی ہے کہ انسان زندہ رہ گئے۔ نیک و بد کا وجود باقی رہ گیا، اور اس نے حضرت محمد مصطفیٰ پر نبوت و رسالت کا خاتمہ کر دیا۔ دل چاہتا ہے کہ پوچھوں، میرے مالک۔ کیا اب بندوں کے لیے نیک و بد کا امتیاز ضروری نہیں ہے۔ کیا اب اچھے بُرے کا فرق بیکار ہو گیا ہے۔ کیا شریعتِ اسلام معطل کر دی گئی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر رسالت و نبوت کا سلسلہ کیوں بند کر دیا گیا ہے۔؟

عجب نہیں قدرتِ جواب دے۔ تو نے غور نہیں کیا جب تک دسترخوان پر تھے تھے مہمان آتے رہے۔ مختلف دل و دماغ کے لوگ مدعو ہوتے رہے۔ اس وقت تک ایک ایسے آدمی کی ضرورت رہی جو انہیں ان تمام

خصوصیات سے باخبر کرتا ہے۔ اور جب آنے والے باخبر ہو گئے —  
 اچھے بُرے کی تمیز کرنے کی صلاحیت والے ہو گئے۔ تو صرف اس آدمی کے  
 ضرورت ہے جو انھیں غلط چیزوں کے استعمال سے روکتا ہے — اور  
 میں نے یہی انتظام کیا ہے کہ جب تک اونچے اونچے دماغ کے انسان  
 پیدا ہوتے رہے۔ انھیں قدم قدم پر راہبری کرنے والے ہادی و رہنما دیے  
 گئے اور جب ذہن کمال کی اس منزل پر پہنچ گئے کہ ایک بیان ساری نسلوں  
 کے لیے کافی ہو جائے تو اب صرف ان افراد کی ضرورت رہ گئی ہے جو نامناسب  
 چیزوں کے استعمال پر پابندی لگاتے رہیں — یہ پیغام تو نہیں ہے لیکن  
 پیغام ہی کا ایک جزو ہے — رسالت نہیں ہے لیکن رسالت ہی کا ایک  
 شعبہ ہے — یہی وجہ ہے کہ میں نے غدیر خم کے میدان میں ولایتِ علیؑ کا  
 اعلان کرنے کے لیے ”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ“ کہہ کر پکارا تھا۔ تاکہ  
 دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ رسولُ دنیا سے جا رہے ہیں لیکن رسالت کی  
 ذمہ داریاں نہیں جا رہی ہیں — پیغامِ رسالتی کا کام ختم ہو چکا ہے لیکن  
 تحفظِ رسالت کا کام باقی ہے اور اسی لیے علیؑ کی جانشینی کا اعلان  
 کر رہا ہوں — اور اس اہمیت کے ساتھ کہ اگر یہ نہیں کیا تو گویا کچھ نہیں کیا  
 اب مجھے کہنے دیجیے کہ غدیر خم کا میدان دُہری عظمتوں کا اعلان کر رہا  
 تھا۔ ایک طرف یہ اعلان ہو رہا تھا کہ تکمیلِ دینِ نبیؐ کے ذمہ تھی اور وہ پہنچی  
 اور دوسری طرف یہ اعلان ہو رہا تھا کہ تبلیغِ دین کا کام امام کے ذمہ ہے  
 اور اس کا سہرا علیؑ کے سر باندھا گیا ہے۔

تکمیل و تبلیغ کے اسی فرق کا اندازہ نہ کرنے کا نتیجہ تھا کہ قوم نبوت و امامت کا فرق بھی محسوس نہ کر سکی اور اسے امامت کی ذمہ داریوں کا بھی صحیح اندازہ نہ ہو سکا۔

مرسلِ اعظمؑ اپنی تمام زندگی . . . . دینِ حق کی تبلیغ بھی کرتے رہے اور قوم کو اس پر عمل کرنے کے لیے بھی آمادہ کرتے رہے۔

اس وقت اس سے بخت نہیں ہے کہ کتنے راستے پر آئے اور کتنے نہیں آئے۔ اس وقت تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مرسلِ اعظمؑ نے اپنے فرض کو ادا کر دیا آیتیں آتی رہیں نبیؐ سناتے رہے۔ پیغامات آتے رہے حضورؐ پہنچاتے رہے احکام نازل ہوتے رہے حضورؐ قوم کو عمل پر آمادہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ غدیر خم میں تبلیغ کا سلسلہ تمام ہوا اور دینِ الہی کو سَنَدِ تکمیل مل گئی۔ اب اس کے بعد کوئی شریعت نازل ہونے والی نہیں ہے۔ کوئی تازہ حکم آنے والا نہیں ہے۔ امامت و خلافت کی ذمہ داری، انھیں احکام کا تحفظ کرنا اور انھیں پیغامات پر عمل درآمد کرانا ہے اور بس۔

لیکن اربابِ کرم؛ ذرا سوچیں کہ امامت کی ذمہ داری کتنی سخت ہے کہ اب تک آیتیں متفرق طور پر نازل ہو رہی تھیں۔ احکام الگ الگ آرہے تھے۔ پیغامات دھیرے دھیرے آرہے تھے اور حضورؐ ایک ایک کر کے قوم کو عمل پر آمادہ کر رہے تھے اور تاریخ گواہ ہے ایسی تدریجی تبلیغ میں بھی قوم کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اور ایسے رفتہ رفتہ عمل میں بھی بغاوت کے جذبات اُبھر آئے اور کسی کو نبوت میں شک ہو گیا کسی نے حضورؐ

کے دماغ پر چمک کر دیا۔ تو اب امامت کی ذمہ داریاں کتنی سخت ہوں گی کہ امام کو بیک وقت ان تمام احکام پر عمل کرانا ہے جنہیں رسولؐ نے ۲۳ سال میں پیش کیا ہے۔ امام کو بیک وقت ان تمام مشکلات کا سامنا کرنا ہے جن کا سامنا حضورؐ نے ۲۳ سال کی عمر تبلیغ میں کیا ہے۔

یاد رکھیے! کہ اگر نبوت کے لیے پہاڑوں جیسا ثبات درکار ہے تو امامت کے لیے بہا لہ جیسے عزم کی ضرورت ہے۔ اگر نبوت کے لیے سمندر جیسی وسعتِ صدر ضروری ہے تو امامت کے لیے طوفانوں جیسا زور و شور۔ اگر نبوت ثباتِ عزم کی طلبگار ہے تو امامت استقلالِ ارادہ کی متقاضی۔ دنیا نبوت کو پہچانے تو امامت کی بلندی کا اندازہ ہو۔ رسالت کی معرفت حاصل کرے تو امامت کی جلالتِ قدر سمجھ میں آئے۔ ذمہ داریوں کا یہی وہ پہاڑ تھا جسے بہر امامؐ نے اپنے سر پر اٹھایا۔ فرائض کا یہی وہ انبار تھا جس نے ہر منزل پر سر کو بارِ دوش بنایا اور ہر امامؐ وقت ہمیشہ قربانیوں کے لیے آمادہ رہا۔

دنیا ان ذمہ داریوں کی قدر نہ کر سکی لیکن رسالت کو تو معلوم تھا کہ میں نے کون سا بوجھ امامت کے سر پر رکھا ہے اور امامت نے میری کس مشکل کو آسان کیا ہے۔ اس لیے دنیا الزامات لگا رہی تھی اور رسالت مسلسل اعلان کر رہی تھی "علیؑ مجھ سے اور میں علیؑ سے ہوں"۔ حسنؑ مجھ سے اور میں حسنؑ سے ہوں۔ حیثینؑ مجھ سے ہے اور میں حیثینؑ سے ہوں۔"

یہ نہ ہوتے تو رسالت منزلِ تعجیل میں کامیاب نہ ہوتی۔ یہ نہ ہوتے تو

تبلیغ رسالت ناتمام رہ جاتی۔ یہ نہ ہوتے تو دین الہی تباہ و برباد ہو جاتا  
یہ نہ ہوتے تو قیامت اللہ صہ ہی میں آجاتی۔ یہ امامت ہی کا زورِ بازو تھا جس  
نے قیامت کو روکے رکھا اور خود بھی ”قائم“ رہی۔

یوں تو امامت کا حوصلہ ہر منزل پر قابلِ دید تھا۔ کوفہ کی مسجد ہو، یا  
مدینہ کا مکان۔ سرشکافہ ہو، یا جگر کے ٹکڑے ہو جائیں، امامت کے  
استقلال میں فرق نہیں آیا، لیکن ان حوصلوں کا کمال کربلا کے میدان میں  
دیکھا جہاں باپ اپنے جوان بیٹے کو بلا کر آواز دے رہا ہے۔ بُنَّی تَقَدَّمَ  
”بیٹا اکبر اب تم جاؤ۔“ میرے لال! حبیبِ رخصت ہو چکے۔ مسلم مارے  
جا چکے، زہیر نے ساتھ چھوڑ دیا۔ چاہنے والے نہ رہے۔ بیٹا! دل چاہتا ہے  
کہ اب تمہارا داغ اٹھاؤں۔ عونت و جھڑپن کے نورِ نظر ہیں۔ قاسم بھیا  
کی نشانی ہے، عباس میرا علمبردار ہے، لیکن میرے لال! تم میرے فرزند ہو  
پہلے تم جاؤ، تاکہ مجھے بہن اور بھائی سے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ لیکن  
دیکھو اکبر! یہ ہے قربانی کی ذمہ داری، کہ میں تمہیں بھیج رہا ہوں۔  
ورنہ بیٹا! تم پر تمہاری چھوٹی کا بھی حق ہے۔ پہلے ان سے اجازت لے  
آؤ۔ اکبر باپ کا حکم پا کر خمیہ میں داخل ہوئے۔ کون مورخ تھا جو اس  
داستانِ غم کو نقل کرتا۔؟ کس کے پہلو میں دل تھا جو زینب کے  
جذبات کا اندازہ کر سکتا۔ جذبات نے بڑھ کر قربانی کی۔ حالات نے اشارے  
دیے۔ ہجومِ مصائب نے قلبِ زینب کے جائزے کا موقع فراہم کیا۔ اکبر  
سامنے آ کے کھڑے ہوئے جس نے اٹھارہ برس مشقتوں سے پالا تھا، اس نے

سراٹھا کر چہرہ کو دیکھا۔ دل تڑپ گیا۔ ارے اس وقت میرے لال کے تیور ہی کچھ اور ہیں۔ اس وقت جیسے اکبر کچھ مانگنے آئے ہیں، جیسے میرا لال کچھ سوال کرنا چاہتا ہے۔ ہائے میں اکبر کے سوال کو کیونکر پورا کروں گی۔ دل زینب تڑپ رہا ہے۔ کہیں اکبر نے پانی مانگ لیا تو کیا ہوگا۔؟ میں نے تو کبھی اپنے لال کے کسی سوال کو رد نہیں کیا۔ اگر آج اپنے اکبر کے مطالبہ کو پورا نہ کر سکی تو میرا کیا عالم ہوگا۔ دل دھڑکتا رہا اور ایک مرتبہ علیؑ کی بیٹی نے سہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ بیٹا کیسے آئے ہو۔ میرے اکبر کیا چاہتے ہو؟ بیٹا خاموش کیوں کھڑے ہو۔ بولو، بولو۔ پھوپھی ستار۔ یہ پھوپھی تیرے ہر سوال کو پورا کرے گی۔ اکبر نے سر جھکا لیا۔

مظلومیت نے آواز دی۔ پھوپھی جان! آیا نہیں، بابا نے بھیجا ہے۔ بیٹا! خیر تو ہے، کیوں بھیجا ہے؟ پھوپھی اماں! بابا نے مجھے سرکٹانے کا حکم دیا ہے۔ میں میدان میں جا رہا ہوں۔ بابا کا حکم ہے کہ آپ سے بھی رخصت لوں۔ فرمائیے، اب کیا حکم ہے؟ آپ نے تو میرے کسی سوال کو رد نہیں کیا۔ فرمائیے پھوپھی اماں، اب کیا خیال ہے؟

زینب نے کلیجہ پکڑ لیا۔ بیٹا! مجھ سے مرنے کی رضائے لینے آیا ہے۔ یہ زینب کا مقدر۔ اب زینب اپنے جوان کو خون میں نہایا ہوا دیکھے گی۔ اب زینب اپنے اکبر کا ماتم کرے گی۔ بیٹا! یہ کیا کہہ دیا۔؟ اکبر خاموش کھڑے رہے۔ پھوپھی اماں جلدی فرمائیے۔ دشمن بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ جوان بیٹا اور باپ پر طعنہ سن سکے یہ

کیسے ممکن ہوگا۔ ؟ پھوپھی اماں ! اگر آپ کا اکبر میدان میں نہ گیا اور بابا پر کوئی  
 آج انگریز تو محشر میں کیا ہوگا۔ ؟ جب دادی اماں سوال کریں گی۔ زینب !  
 تجھے اکبر پیارا تھا اور میرا حسین پیارا نہیں تھا، تو کیا جواب دیکھے گا۔ ؟  
 حسین پر مصیبت کا ذکر سنا تو زینب کا دل تڑپ گیا۔ فرمایا جاؤ  
 اکبر جاؤ۔ بیٹا ! اگر تمہارے قربان ہو جانے سے میرا حسین نچ جائے تو  
 ہزار اکبر قربان کر سکتی ہوں۔

پھوپھی سے اجازت لے کر اکبر نے بیبیوں کو آخری سلام کیا۔  
 خیمہ کے دروازے پر آئے۔ پردہ اٹھا کر باہر نکلنا چاہا۔ ایک مرتبہ کسی  
 نے بڑھ کے دامن تھا ما۔ اکبر کہاں جا رہے ہو۔ ؟ روایت میں کسی  
 کا نام تو نہیں ہے لیکن میرا دل کہتا ہے کہ کسی بزرگ نے روکا ہوتا تو بازو  
 پکڑا ہوتا۔ یہ دامن کیوں۔ ؟ عزادارو ! کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ کس  
 بہن نے آکر دامن تھا م لیا ہو۔ بھئی ! تم میدان میں جا رہے ہو۔ ؟  
 ہمارا کون پرسان حال ہوگا۔ ؟ اکبر ! ہمارے حال پر بھی رحم کرو۔  
 اکبر پلٹے۔ خیمہ میں آئے۔ دوبارہ رخصت ہوئے۔ پھر کسی نے  
 روکا۔ راوی کہتا ہے کہ سات مرتبہ خیمہ کا پردہ اٹھا اور گرا۔ اکبر بار بار  
 پلٹ کر خیمہ میں گئے اور ایک مرتبہ سیدانیوں نے اپنے حلقے میں لے کر کہا  
 اکبر ! جاتے تو ہو لیکن ہماری غربت کا خیال رکھنا۔ یہ سنا تھا  
 کہ اکبر تڑپ گئے۔ پلٹ کر کہا۔ بیبیو ! تمہیں اپنی غربت کا خیال ہے اور  
 میرے بابا کی بیسی کا خیال نہیں ہے مجھے جلدی رخصت کرو۔ یہ کہہ کر

بڑھے اور اب پردہ اٹھا کر یوں نکلے جیسے کسی بھرے گھر سے جوازہ نکلتا ہے۔  
 باپ کے سامنے آئے۔ باپ نے پوچھا، بیٹا! رخصت لے آئے  
 —؟ کہا ہاں بابا۔ مجھے پھوپھی نے رخصت کر دیا اور سیدانیوں نے  
 بھی رخصت دیدی۔ حسین نے دھڑکتے دل کے ساتھ اکبر کے چہرہ  
 کو دیکھا۔ اور اسلحہ جنگ سجا کر گھوڑے پر بیٹھا کر کہا، جاؤ بیٹا خدا کو  
 سونپا۔ لیکن دیکھو میرے لال! جب تک میرا اور تمہارا سامنا رہے  
 مڑ مڑ کر دیکھتے رہنا۔ اکبر چلے۔ حسین دل سنبھالے بیٹھے رہے  
 چیز لمحے گزرے تھے کہ ایک مرتبہ اکبر نے آہٹ محسوس کی جیسے کوئی آ رہا ہے۔  
 مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھا کہ ضعیف باپ کمر پکڑے چلا آ رہا ہے۔ رُک کر آواز دی  
 بابا! آپ نے تو رخصت کر دیا تھا۔ یہ اب کیسے تشریف لائے —؟  
 حسین نے دل پکڑ کر کہا، بیٹا! کاش تم صاحبِ اولاد ہوتے تو تمہیں یہ  
 اندازہ ہوتا کہ جوان بیٹے کو رخصت کرنے کے بعد باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے  
 — جاؤ اکبر جاؤ۔ بس حسین تمہارا دیدار کر چکا۔

اکبر چلے حسین بارگاہِ احدیت میں فریاد کر رہے ہیں۔ مالک! گواہ  
 رہنا شبیہ رسول کو بھیج رہا ہوں — اُسے بھیج رہا ہوں جس کے چہرہ کو  
 دیکھ کر نانا کی زیارت کیا کرتا تھا۔ مالک اب شبیہ پیغمبرِ خاک میں ملنے  
 جا رہی ہے۔

حسین درخیم پر بیٹھے ہیں — ادھر پالنے والی کا دل تڑپا  
 — ایک مرتبہ فضلہ کو بلا کر کہا، فضلہ جاؤ۔ اور جا کر درخیم پر کھڑی

ہو جاؤ۔ مولا کے چہرہ پر نظر رکھنا۔ جو ان بیٹے کا معاملہ ہے اکبر  
پر کوئی وقت پڑے گا تو چہرہ کا رنگ بدل جائے گا۔ ایک مرتبہ فضل نے  
دوڑ کر خبر سنائی۔ بی بی۔ آپ کے اکبر کی خیر نہیں ہے۔ آقا کے چہرے  
کا رنگ بدل گیا ہے۔ شہزادی نے مولا کو بلایا۔ آقا میرے اکبر کی خیر  
تو ہے۔ کہا، ہاں۔ اکبر سلامت ہے لیکن ایک نامی پہرہ سوان کا  
مقابلہ ہو گیا ہے۔ وہ سیر و سیراب ہے اور میرا اکبر تین دن کا پیاسا ہے  
دعا کرو، اللہ میرے اکبر کو فتح دے۔ پالنے والی کا دل تڑپا۔ سید انیوں کو  
آواز دی۔ بی بیو! او مجھ دکھیا پر ایک وقت پڑا ہے۔ میں دعا کرتی  
ہوں، تم آمین کہنا۔ دعا شروع ہوئی۔ اے یوسف کو یعقوب تک  
پلٹانے والے! میرے اکبر کو پلٹا دے۔ دعا تمام نہ ہوئی تھی کہ فضل نے  
آکر خبر دی۔ بی بی آپ کا لال میدان سے واپس آیا ہے۔ دل ٹھہرنے ہی  
والا تھا کہ پھر خبر ملی۔ بی بی! اکبر پھر میدان میں گئے۔ شہزادی کلیجہ  
پڑا کر بیٹھ گئی۔ ہٹے میرا اکبر پھر میدان میں گیا۔ دکھیں! مقدر  
اب کیا دکھاتا ہے۔ ابھی اس اضطراب میں دل دھڑک رہا تھا کہ ایک مرتبہ  
خیمہ میں آواز آئی سنی ہاشم کے بچو! آؤ۔ ضعیف باپ سے جو ان  
بیٹے کا جنازہ نہیں اٹھتا۔ خیمہ کا پردہ اٹھا۔ زینب نکلیں۔  
حسین نے جنازہ اکبر کو رکھا۔ سر پر ردا ڈالی۔ ارے زینب! تم  
کیوں آئیں۔ بھیا، کیا کروں، تمہیں کیسے اکیلا چھوڑ دوں۔ لاؤ بھیا!  
میں اپنے لال کو اٹھالوں گی۔ میں نے بچنے سے گودی میں اٹھایا ہے

حسین نے کہا، بہن واپس چلو۔ زینب کو واپس لائے۔ درخیمہ تک پہنچایا۔

دل چاہتا ہے عرض کروں، آقا! ابھی تو زینب کے سر پر چادر ہے ابھی خیمہ سے نکلنے میں کیا نقصان ہے۔ آقا اس وقت کیا ہوگا جب عصر عاشور زینب جلتے خیمہ سے نکلیں گی۔ سر کے بال بکھرائے ہوئے منہ پر طمانچے مارتی ہوئی۔

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَاعْلِيَّاهُ وَاحْسِبْنَاهُ  
 ” وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ • “

۱۱

أَعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ .  
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ .  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ . وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ  
 عَلَى سَيِّدِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ . حَبِيبِ اللَّهِ الْعَالَمِينَ  
 سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا أَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّيِّبِينَ  
 الطَّاهِرِينَ وَلَعْنَةُ اللَّهِ الدَّائِمَةُ الْبَاقِيَّةُ عَلَى  
 أَعْدَائِهِمْ أَجْمَعِينَ مِنَ الْآنِ إِلَى قِيَامِ يَوْمِ  
 الدِّينِ أَقْبَلُ فَمَا لَمْ يَنْقَلِقْ قَالَ اللَّهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ  
 ” وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ “

( اور محمد صرف اللہ کے رسول ہیں ۔ )

قرآن حکیم نے ان دو لفظوں میں سرکارِ دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ  
 صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کو دراز اور بلندی منزل کو یونہی سمیٹ دیا  
 جیسے انسانی جسم میں عالمِ اکبر سما یا ہوا ہو۔ یا جس طرح نقطہٴ باء میں پورا  
 قرآن سمٹ آیا ہو۔

سرکارِ دو عالم کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ اس بات کا گواہ ہے کہ حضورؐ کی زندگی ایک عالمِ اکبر ہے اور قرآنِ حکیم کا یہ فقرہ اس کا جسدِ اطہر حضورؐ کا کردارِ قرآنِ عظمت ہے، اور یہ فقرہ اس کا نقطہٴ بار۔ یہ تو مالکِ کائنات ہی جانتا ہے کہ وہ کس بلند کردار والے کو محمدؐ کہتا ہے۔ اُس کی نظر میں رسول ہونے کے لیے کس طہارتِ نفس۔ بلندیِ اخلاق۔ عظمتِ کردار۔ ثباتِ عزم اور شدتِ استقلال کی ضرورت ہے لیکن جہاں تک حضورؐ کی زندگی کے جائزہ کا تعلق ہے، تاریخ کے اوراق نے نشاندہی کی ہے کہ آپؐ نے تبلیغِ دین اور پیغامِ الہی کے پہنچانے میں کیا اہتمام برتا ہے اور کن شراہد و مصائب کا سامنا کیا ہے۔

رسالت ایک عظیم منصب ہے جسے خالقِ کائنات اپنے منتخب بندوں کو عطا کیا کرتا ہے اور جس پیغام کی جتنی زیادہ اہمیت ہوتی ہے اتنی ہی عظیم شخصیت کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ خدا کا آخری پیغام صبحِ قیامت تک رہنے والا تھا۔ خدا نے اس کے لیے جس نبی کا انتخاب کیا اسے کمالات بھی اس قدر عطا کر دیے کہ عمرِ دنیا تک ترقی کرنے والا انسان بھی اس منزل تک نہ پہنچ سکتے اور کسی دور کے انسان کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ محمدؐ عربی کا مرتبہ ہم سے کمتر تھا اور ان کا دین ہمارے ترقی یافتہ ذہنوں کے لیے ناکافی ہے۔

انسان تو انسان کل کا مسلمان بھی معراجِ پیغمبرؐ کا ذکر سن کر تعجب کیا کرتا تھا کہ آسمانوں میں راستہ کیسے بنا ہوگا۔ چین لمحوں

میں اتنی طویل مسافت کس طرح طے ہوئی ہوگی۔ آسمانوں کے شگاف کے بغیر اور پر کیسے گئے ہوں گے۔ وہ سواری کیسی ہوگی جس میں اتنی تیز رفتاری پائی جاتی ہو۔ وہ جبریلؑ کیسا ہوگا جو آسمان کے تمام راستوں سے یوں باخبر ہو کہ چند لمحوں میں سیر کر کر واپس لے آئے۔ ؟

یہ عظیم سنگی نظر اور کوتاہی علم اور اس پر مزید یونان کا فلسفہ — فلسفہ یونان سے معنویت نے ذہنوں کو مفلوج بنا دیا تھا اور مسلمانوں نے عاجز آ کر معراجِ روحانی کا سہارا لیا۔ آیتِ قرآنی کو جھٹلا میں تو ایمان جلے۔ فلسفہ یونان کی تکذیب کریں تو علم کہاں سے آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھبراہٹ میں ایک درمیانی راستہ نکال لیا۔ حضورِ معراج میں گئے ضرور مگر جسم کے ساتھ نہیں، بلکہ سماوات کی ساری سیر حضور کی روحِ اقدس کا کارنامہ تھا، جسمِ اطہر تو فرشِ خواب پر تھا، اور یہ مطلب اتنا قیمتی معلوم ہوا کہ اس کی تائید میں حدیثیں بھی تیار کیں اور روجہ کی زبان سے گواہی و لوادی کہ حضورؐ بسترِ استراحت پر تشریف فرما تھے۔

مسلمان کو کیا خبر کہ اس کی کوتاہی نظر، مذہب کا کیا حشر کرے گی؟ یونان کا یہ فلسفہ حقائقِ اسلام کو کس ٹھکانے لگائے گا۔ اسے تو رائے قائم کرنے سے مطلب اور چند درہم و دینار مل جائیں تو حدیثیں وضع کرنے سے غرض — میں بھی سوچا کرتا تھا کہ جب مسئلہ معراج اتنا مشکل ہے۔ راتوں رات سیر کی منزل اس قدر دشوار ہے کہ امتِ قرآن کے حلق سے بھی نہیں اُترتی تو مالکِ کائنات کو لے جانے کی ضرورت ہی کیا تھی، اور اگر لے ہی گیا تھا تو بیات

کو پردہ راز میں رکھا ہوتا نہ مسلمانوں کو اطلاع ہوتی، نہ ذہن پہنکتے نہ فلسفہ کے مسائل اُلجھتے اور نہ عقائد خراب ہوتے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ مالکِ کائنات لے گیا اور عجیب انداز سے لے گیا۔ لے گیا تو اتنا چھپا کر کہ پاس والوں کو بھی خبر نہ ہوئی اور اعلان کیا تو ایسا ڈنکے کی چوٹ پر کہ صبح محشر تک آنے والوں کو خبر ہو جائے۔

آج دورِ حاضر کی بے پناہ ترقیاں نہ ہوتیں تو مذہب کا یہ فلسفہ سمجھ میں بھی نہ آتا۔ انسان اس طرح آگے نہ بڑھتا تو حقائقِ مذہب تشنہ ہی رہ جاتے۔ یہ ترقی دنیا کا احسان ہے کہ حقائقِ مذہب کھلتے جا رہے ہیں اور تائیدِ مذہب کو مواد ملتا جا رہا ہے، یہ اور بات ہے کہ ترقی کرنے والے ان حقائق سے بے خبر ہیں اور ان کی نفس پرستی اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ مذہب کے انکار ہی میں عافیت ہے اور توحید و رسالت سے فرار ہی میں آزادی کا تحفظ ہے۔

اگر آج معراجِ پیغمبرؐ کا تذکرہ نہ ہوتا اور دنیا ترقی کرتے کرتے چاند سورج کی منزلوں کو طے کر لیتی۔ انسانی قدم چاند کی زمین کو اپنی جوتیوں سے روند دیتے تو انسانی دماغ کہاں ہوتا اور کیا اسے یہ کہنے کا موقع نہ ہوتا کہ اتنا ترقی یافتہ انسان مکہ مدینہ کے راستوں پر اونٹ پر بیٹھ کر چلنے والے کی پیروی نہیں کر سکتا۔ اونٹ پر بیٹھنے والا صحرا نشینوں کے لیے نظامِ زندگی پیش کر سکتا ہے، فلک پیمائی کے لیے نہیں۔

یہ احسان تھا معراجِ پیغمبرؐ کا، کہ اس نے ناطقے بند کر دیے۔ زبانوں

پر سپرے لگا دیے اور آواز دی خبردار۔! میرے حبیب سے  
مقابلہ نہ کرنا۔ ہزاروں وسائل اور آلات فراہم کر کے چاند تک جانا  
تمہارا کام ہے اور براقِ جذب و محبت پر بیٹھ کر عرشِ اعظم کی سیر کر کے  
چشمِ زدن میں پلٹ آنا محمد کا کام ہے۔

دنیا معراجِ پیغمبر پر ایمان لائے یا نہ لائے اتنا تو ماننا ہی پڑے گا  
کہ قرآنِ حکیم میں اس معراج کا تذکرہ ہے۔ اس کے دامن میں سفرِ پیغمبر کی  
داستان ہے اور یہ خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جس دور کا انسان  
سیرِ سماوات کے بارے میں سوچنے سے قاصر تھا اس دور میں قرآنِ حکیم  
اس سیر کی روداد سنارہا تھا۔

اربابِ نظر۔! فیصلہ کریں جو خدا جہالت کے دور میں اتنی  
عظیم داستان سنا سکتا ہے۔ جو مالکِ انسانی بے خبری کے ماحول  
میں ان خصوصیات کی اطلاع رکھتا ہے، اور دنیا کے لیے یہ اطلاعات  
فراہم کر سکتا ہے، کیا اس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اپنے حبیب  
کو راتوں رات آسمانوں کی سیر کرادے۔

یہ قرآنِ حکیم کا معجزہ تھا کہ اس نے دنیا کے افرادِ انکار کی  
پرواہ کیے بغیر قصہ معراج کو بیان کر کے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا۔  
میرا سابقہ مکہ مدینہ کی قوم سے ہوتا تو میں ان کے جذبات کا خیال  
کر کے واقعہ پر پردہ ڈال دیتا، لیکن مجھے صبحِ محشر تک رہنا ہے اور پوری  
نسلِ انسانی کو پہنچ کرنا ہے، اس لیے میں نے واقعہ کو محفوظ کر لیا ہے

اور آج بھی میرا اعلان ہے کہ سیرِ قمر کرنے والے اور ہیں اور سیرِ عرش کرنے والے اور۔ چاند پر جانے والے اور ہیں اور چاند کو دو ٹکڑے کرنے والے اور۔ ستاروں کی منزلوں کو ڈھونڈنے والے اور ہیں اور ستاروں کو اپنی ڈیورھی پر بلانے والے اور۔ کائنات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسان اور ہیں اور کائنات کا اقتدار اپنی مٹھی میں رکھنے والے اور۔ یاد رکھو! جو اپنے نفس کا بندہ ہوتا ہے وہ پابندِ کائنات ہوتا ہے اور جو خدا کا بندہ ہوتا ہے وہ محتارِ کائنات ہے۔ جو خدا سے بے نیاز کو بھول جاتا ہے وہ ساری کائنات کا فقیر ہوتا ہے اور جو کترِ مخنی کو پالتا ہے وہ جناب امیر ہوتا ہے۔

ایک معراج اور شق القمر ہی کا ذکر نہیں، حیاتِ پیغمبرؐ کے چھوٹے چھوٹے واقعات بھی اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ خدا کا رسولؐ عظمتوں کی اس منزل پر فائز ہے جہاں تک پہنچنا ذہنِ انسانی کے لیے ناممکن ہے چہ جائیکہ جسمِ انسانی۔

دورِ حاضر کی مدہوش کن ترقیوں میں ایک ترقی یہ بھی ہے کہ انسان نے ایسے آلات ایجاد کر لیے ہیں جن کے ذریعہ پورے مکان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر لیتا ہے۔ سیرِ قمر کے بعد یہ بات زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتی لیکن ان کے دل سے پوچھیے جنہیں آسمانوں کی سیر ایک پہیلی معلوم ہوتی ہے۔ اور جو چاند اور سورج کے فاصلوں کو ایک افسانے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ کہ آسمانوں کی سیر تو رُبی بات ہے زمین پر بھی

ایسا کوئی واقعہ ناممکن ہے۔ بھلا پوری زمین کیسے اٹھائی جائے گی۔ اور اگر زمین اٹھائی جائے گی تو عمارت کس طرح قائم رہے گی اور اگر عمارت قائم رہ جائے گی تو راستہ کس طرح طے ہوگا، اور اگر راستہ طے ہو جائے گا تو دوسری عمارت نصب کس طرح ہوگی۔؟

اس طرح کے بے شمار خیالات ذہنوں میں گونج رہے ہیں اور انسان ہر ترقی کو ایک مضحکہ کا درجہ دے رہا ہے۔ مجھے اس سے بحت نہیں ہے کہ یہ واقعات صحیح ہیں یا غلط۔ دنیا انہیں مانتی ہے یا نہیں۔ مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جب آج کے ترقی یافتہ دور میں یہ باتیں مضحکہ خیز نظر آتی ہیں، تو کل کے جاہلیت زدہ ذہنوں میں یہ بات کسی رہی ہوگی اور ان کے سامنے ایسی گفتگو کس قدر دشوار رہی ہوگی۔ لیکن اللہ نے مصلحت پیغمبرؐ، کہ حضورؐ نے کل کے حالات میں انہیں جاہلی ذہنوں کے سامنے ایک اشارے سے درخت کو اپنے پاس بٹا لیا اور پھر واپس بھی کر دیا، تاکہ آنے والی دنیا اپنی ترقیوں پر ناز نہ کر سکے اور اسے اندازہ رہے کہ جو کام آج تم آلات و وسائل کی مدد سے کر رہے ہو کل اس سے بالآخر کام خدا کا رسولؐ اپنی روحانی طاقت سے کر چکا ہے۔ وسیلہ کا محتاج انسان ہوتا ہے اور وسائل سے بے نیاز نماندہ رب العالمین۔

عزیزانِ محترم۔! انسانی ترقی اس منزل پر آچکی ہے جہاں انسان ہر مخلوق کے احساس و شعور کا اندازہ کرنے لگا ہے۔ کل یہ بات مسلمات میں تھی کہ جمادات و نباتات میں شعور کا گزر نہیں ہے۔ یہ بات حیوانات کے ساتھ

مخصوص ہے اور منزل حیوانیت پر پہنچنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے لیکن آج کے انسان نے سائنسی آلات کی مدد سے یہ اندازہ بھی کر لیا ہے کہ دنیا کی ہر مخلوق میں ایک طرح کا شعور پایا جاتا ہے۔ پتھر بھی درد و رنج کا احساس رکھتے ہیں اور نباتات کو بھی اپنے دکھ درد کا اندازہ ہوتا ہے۔

بعض پتھروں سے پانی کے قطرے کا ٹپکنا علامت ہے کہ اس کے احساس کی گرمی قطرہ آشک بن گئی ہے۔ درختوں میں طرح طرح کے تغیرات کا پیدا ہونا دلیل ہے کہ موسم کے تاثر نے اس میں یہ انقلاب پیدا کیے ہیں۔ ممکن ہے کہ انسان حیوان کے شعور میں اتنا فرق ہو کہ انسان کو اپنے شعور کا شعور بھی ہوتا ہو اور حیوان میں شعور کے شعور کی طاقت نہ ہو۔ لیکن اسے بھی کون جانتا ہے جب کہ خود قرآن مجید نے پتھروں کے احساس کی تعریف کی ہے اور ایک مقام پر پتھر کو انسانی دل سے بہتر قرار دیتے ہوئے ارشاد کیا ہے کہ ”پتھر سے تو پانی بھی نکل آتا ہے لیکن انسان کے دل پر تو اتنا بھی اثر نہیں ہوتا۔“

دوسرے مقام پر خود اپنی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ ”اگر میں اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کر دیتا تو وہ بھی خوفِ خدا سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔“

خوفِ خدا کا تصور کیا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے ذریعہ اللہ نے اس کی قوتِ احساس کا اندازہ کرایا کہ اسے (پہاڑ کو) دکھ درد کا اندازہ ہے۔ اُردو کے عظیم شاعر غالب نے اسی نکتہ کی طرف

اشارہ کیا تھا: ۵

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا

جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

مقصد یہی ہے کہ غم انسان کو دیا گیا ہے تو اس کے دل پر اثر نہیں ہوتا  
ورنہ یہی اگر شرار بنا کر تھکر کو دیدیا جاتا تو وہ خون کے آنسو روتا اس لیے کہ  
اس کی قوتِ احساس بہت سے انسانوں سے بہتر ہے۔ حیرت ہے کہ ایسے  
حالات میں بھی انسان قلبِ احساس کو ”سنگدلی“ سے تعبیر کرتا ہے۔ میرا  
خیال تو یہ ہے کہ اگر تھکر کو زبان دیدی جاتی اور اسے بھی اپنے خیالات کے  
اظہار کی اجازت ہوتی تو وہ ایسے انسانوں کے خلاف احتجاج کرتا جن کی  
قوتِ احساس جمادات و نباتات کے برابر بھی نہیں ہے۔

غالب کے کلام کو شعاعِ انہ تصورات کا درجہ دیا جاسکتا ہے لیکن اتنا  
ضرور ماننا پڑے گا کہ غالب اتنا عظیم تصور بھی کہیں سے لیکر آئے ہیں۔ ان کا  
ذہن بھی مافوق کائنات نہیں ہے کہ انھوں نے ایک اتنا عظیم تصور پیش کر دیا۔  
۔۔۔۔۔ یہ ان کے لاشعور کی آواز ہے جسے انھوں نے خود محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو  
اکثر نقاد ان سخن محسوس نہیں کر سکتے۔

عسزینِ محترم — ! کل جب فراقِ رسولؐ میں درخت کے گریہ کی  
بات کہی جاتی تھی تو اہل دنیا مذاق اڑایا کرتے تھے اور آج جب سائنس نے  
اس مضحکہ کو حقیقت سے قریب تر کر دیا ہے تو ہر تازہ ذہن تسلیم کرنے کے  
لیے تیار ہے اور ہر دماغ تائید کرنے کے لیے آمادہ ہے۔ اب اندازہ ہوتا ہے

کہ روحانی کمالات درختوں کو بھی متاثر بنا سکتے ہیں — تو اب مجھے کہنے دیجیے کہ جب رسول اکرم کے عارضی فراق میں درخت صدائے نالہ بلند کر سکتا ہے تو جب رسول اکرم کا فرزند صحرائے کربلا میں بھوکا پیاسا شہید ہو گا تو کیا تعجب ہے کہ آسمان سے خون برس رہا ہو اور زمین سے جو تھپہر اٹھایا جائے اس کے نیچے خونِ تازہ جوش مارا ہو، ایسا معلوم ہونا ہے کہ کائنات نے حسین کا سوگ منایا ہے اور مالک کائنات نے پوری دنیا کو زہرا کے لال کا سوگوار بنا دیا ہے۔ کیوں نہ ہوتا۔ زہرا نے اپنا بھرا گھر راہِ خدا میں دے دیا، لیکن یہ حسرت لیکر دنیا سے گئیں کہ کاش میں زندہ رہتی تو اپنے حسین کا ماتم کرتی — ابو الحسن رہتے تو اپنے حسین پر روتے — بابا رہتے تو اپنے نواسے کا غم منانے — میرا حسن ہی رہتا تو اپنے بھائی کا جنازہ اٹھاتا — لیکن اسے کیا کیا جلتے کہ تسلسلِ امامت درمیان میں ہے اور سب کو پہلے رخصت ہونا ہے — آخر میں ایک حسین کو تنہا کر بلا کے میدان میں رہ چانا ہے جس کے لیے زہرا کو فکر ہے — بابا! جب کوئی نہ رہے گا تو میرے حسین پر روئے گا کون ؟

مرسلِ اعظم نے تسلی دی، بیٹی — ! خدا ایک قوم کو پیدا کرے گا جس کے مرد، مردوں کا ماتم کریں گے اور اس کی عورتیں، عورتوں پر آنسو بہائیں گی۔

میرا دل چاہتا ہے عرض کروں حضور — ! بیٹی کے دل کو سنبھالیے، یہ قوم کی کیا ضرورت ہے۔؟ فرما دیجیے زینبؓ رہے گی، ام کلثومؓ صدفِ عزا

پچھائے گی۔ میرا سید سجاد ماتم کرے گا۔ لیکن عزادارو! ایسا نہیں ہوا  
 پیغمبر نے قوم ہی کا نام لیا۔ تو اب دوہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ یا تو زہرا کا  
 مقصد تھا کہ قیامت تک یہ ماتم کس طرح قائم رہے گا اور باپ نے تسکین  
 دی کہ ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہیں گے جو اپنی زندگیوں کو تیرے لال  
 کے لیے وقف کر دیں گے۔

کہتے تو عرض کروں شہزادی! آئیے اور اگر دیکھیے۔ آج اس قوم کا  
 ہر بچہ، اس قوم کی ہر خاتون اور اس قوم کا ہر بزرگ و جوان آپ کے لال  
 کا ماتم کر رہا ہے۔ شہزادی! انھوں نے کبھی اپنے عزیزوں کے غم میں سر و سینہ  
 نہیں پیٹا۔ انھوں نے کبھی اپنے باپ کے ماتم میں خون نہیں بہایا۔  
 انھوں نے کبھی اپنے رشتہ داروں کا یوں غم نہیں منایا۔ یہ صرف آپ کے لال کا  
 ماتم ہے کہ ہر ماں اپنے بچے کے جسم سے بہتا ہوا خون دیکھ کر خوش ہو رہی ہے  
 ہر باپ اپنے فرزند کو اپنے سے جدا کرنے پر تیار ہے۔

شہزادی۔ اب اس قوم کے دن، دن نہیں رہے۔ اس کی راتیں  
 آرام کے لیے نہیں رہیں۔ اسے صرف آپ کے لال کے ماتم کی دھن ہے۔ اس  
 کے ذہن پر اپنا گھر نہیں ہے کہ بلا ہے۔ اس کی نظروں میں اپنے لال نہیں ہیں  
 کہ بلا کے نونہال ہیں۔ اس کی مائیں بچوں کو دیکھتی ہیں تو انھیں رباب کی  
 اجڑی گود نظر آتی ہے۔

عزادارانِ حسین! مرسلِ اعظم کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے  
 کہ بیٹی زہرا! تیری زینبؑ تو رہے گی۔ تیری ام کلثومؑ تو رہے گی۔

تیرا استیجاد . . . . . تو رہے گا۔ لیکن انھیں رونے نہ دیا جائے گا ان کے ماتم پر پابندی ہوگی، ان کی آنکھوں سے آنسو گریں گے تو اشقیار انھیں نوک نیزہ سے اذیت دیں گے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ مرسلِ اعظمؐ نے مردوں کے ساتھ عورتوں کا نام بھی لے لیا۔ گویا مقصد یہ تھا کہ فاطمہؑ تیری بیٹیاں کیا ماتم کریں گی۔ ان کی حالت تو خود ایسی ہوگی کہ آنے والی قوم ان کی مظلومیت کا ماتم کرے گی۔

اربابِ عزا۔ ! مجلس کا سلسلہ تمام ہو رہا ہے۔ آج ہمیں اور آپ کو زہرا کے لال کا ماتم کرنا ہے۔ حسینؑ کی دکھیا ماں رومال لے کر آگئی ہے اور ایک ایک ماتم دار کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ رہی ہے۔ اللہ رے ذمہ داری زہراؑ خود بھی آنسو بہائیں اور سوگواریوں کے آنسو بھی جمع کریں۔ فاطمہؑ کہ بلا میں کتنا روئیں کون جانتا ہے۔ کسی کا زہرا جیسا دل اور حسینؑ جیسا لال ہو تو اندازہ کرے کہ ایسے لال کی شہادت پر ایسی ماں کا کیا حال ہوتا ہے۔ ہاں تاریخ کر بلا نے چند منظر بیان کیے ہیں۔

آپ برابر سنتے رہتے ہیں کہ عاشور کی رات جب فرزندِ رسولؐ مقتل کی طرف گئے تو ایک تشیب سے کسی بی بی کے رونے کی آواز آئی۔ آپ نے پہچانا، وہ کون بی بی تھی، اور کیا کر رہی تھی؟ عجب نہیں مادرِ حسینؑ بقیع سے آئی ہوں۔ میرے لال! کل تو اسی زمین پر گھوڑے سے گرے گا۔ میرے حسینؑ! آتیرے مقتل کی خاک کو اپنے بالوں سے صاف کر دوں۔ حسینؑ میرے آنسو کس طرح تھیں، بیٹا! کل یہاں میرا باغ اُجڑ جائے گا۔ جس کے جسم پر میں نے ہلکی سی

تکلیف برداشت نہیں کی کل اس کا جسم تیروں پر رہے گا۔ جس گلے کے میں نے بوسے لیے ہیں اس پر شمر کا خنجر چلے گا۔ — واحیناہ واحیناہ۔

حسین پلٹ کر خمیہ میں آئے۔ چاہنے والو دروازہ پر بیٹھا ہے ایک مرتبہ بہن نے کہا، بھیا! آپ نے اپنے ساتھیوں کو آڑا لیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو میدان میں تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔ حسین کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ صحابی دوڑا ہوا مجمع اصحاب میں آیا۔ حبیب، زُہیر، مسلم، غضب ہو گیا۔ — دختر زہرا کو ہماری وفا پر اعتماد نہیں ہے۔ چلو جلدی چلو۔ چل کے زینب کو اپنی وفا کا اعتماد دلایں۔ — اصحاب اٹھے۔ تلواریں نیام سے نکالیں۔ نیام کو توڑ کر پھینکا۔ درخیمہ پر آکر آواز دی۔ — علی کے لال! دختر زہرا سے کہہ دیجیے، یا تو ہماری وفا پر بھروسہ کریں یا ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنے گلے اپنے ہاتھ سے کاٹ کر پھینک دیں۔ ہم اس دن زندہ رہ کر کیا کریں گے جب دختر زہرا کو ہماری وفا پر اعتماد نہ ہوگا۔

حسین نے سمجھایا، زینب کا دھڑکا ہوا دل ٹھہرا۔ عاشور کی رات تمام ہوئی لیکن، عزا دارو! جس زینب نے اصحاب کے یہ جوصلے دیکھے ہوں گے جب اس نے عصرِ عاشور بھائی کو رخصت کیا ہوگا اس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ کیا دل نے نہ پکارا ہوگا۔ حبیب، مسلم، زُہیر! اب کہاں ہو؟ — میرا حسین اکیلا رہ گیا ہے اور عجب نہیں شہزادی نے مقتل کا رخ کر کے آواز دی ہو۔ اکبر، آؤ، عوٹو، محمد اٹھو، قاسم کہاں گئے۔ عباس کیا تم بھی سو گئے۔ تمہارا مولا اکیلا رہ گیا۔

اللہ رے حوصلہ زینبؓ بھائی کو کلیجے سے لگایا، گلے کے بو سے لیے، رخصت کیا۔ گھوڑے پر سوار کیا۔ عزا دارو! کبھی کسی بہن نے اپنے بھائی کو مرنے کے لیے رخصت کیا ہے۔؟ یہ زینبؓ ہی کا کلیجہ تھا کہ اپنے ہاتھوں سے گھوڑے پر سوار کر دیا۔ حسینؑ مقل کی طرف چلے۔ زینبؓ کا دل تڑپا۔ بھیا! بہن نے سوار تو کر دیا ہے لیکن دل تڑپ رہا ہے کہ اگر تمہیں اترنا ہو گا تو کون سہارا دے گا۔

ایک مرتبہ فضائے کربلا میں آواز گونجی۔ زینبؓ گھبرانا نہیں۔ جس نے چچی پیس پیس کر پالا ہے وہ اپنی گودی میں سر رکھ لے گی۔ مدینہ سے رسولؐ آئیں گے۔ نجف سے علیؑ آئیں گے بقیع سے زہراؑ آئیں گی، اور اپنے حسینؑ کو سہارا دیں گی۔

روایت کہتی ہے کہ جس وقت شمر کا خنجر حسینؑ کے گلے پر چل رہا تھا، تو ایک آواز گونج رہی تھی، میرے لال، میرے حسینؑ تجھے میری نگاہوں کے سامنے ذبح کر دیا۔ بیٹا! تجھے پانی بھی نہیں ملا۔ ہائے حسینؑ۔ ہائے میرے لال۔

” اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُوْنَ .“

(۱۲)

أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ  
 بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ • وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ  
 وَالتَّحِيَّةُ وَالْإِكْرَامُ عَلَى أَشْرَفِ الْأَنْبِيَاءِ وَسَيِّدِ  
 الْمُرْسَلِينَ وَإِلَيْهِ الطَّيِّبَاتُ الطَّاهِرَاتُ وَاللَّعْنَةُ  
 الدَّائِمَةُ عَلَى أَعْدَائِهِمْ وَقَتْلَهُمْ أَجْمَعِينَ مِنَ  
 الْأَنْبِيَاءِ قِيَامِ يَوْمِ الدِّينِ • أَمَا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ  
 اللهُ الْحَكِيمُ فِي كِتَابِهِ الْكَرِيمِ  
 ” وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ “

( ” اور محمد صرف اللہ کے رسول ہیں۔ “ )

مقام محمدیت کا حامل، عظمت رسالت کا مالک اور الٰہی اللہ کے  
 کی دو پہر کو ولایت علیؑ کا اعلان کر کے اپنی رسالت کو منزل تکمیل تک پہنچا  
 کر ۲۸ صفر ۱۱ھ کو صبح کو ابدی نیند سو گیا۔ کانٹوں پر چلنے والے کے زیر قدم  
 گلشن جنت آگیا، پتھر کھانے والے پر پھولوں کی بارش ہونے لگی جس کا خاک

برداشت کرنے والے کے گرد جنت کی بہاریں طواف کرنے لگیں۔  
 مکے کے مشرکین اور مدینہ کے منافقین کے مظالم برداشت کرنے والے  
 کو جو ارب رب العالمین مل گیا۔ اب اسلام ہے اور منزلِ تعین۔ علی بن ابی طالبؑ  
 ہیں اور ترویجِ دینِ مبین۔ نسلِ ابوطالب ہے اور تحفظِ رسالت کی  
 ذمہ داری۔

مولائے کائنات علی بن ابیطالبؑ نے دین کو منزلِ تعین سے آشنا  
 بنانے میں بے پناہ مصائب کا مقابلہ کیا۔ ۲۵ سال تک گوشہ نشین رہنا  
 پڑا تو رہے۔ جبل و صفین و نہروان کے میدانوں میں آنا پڑا تو آئے۔  
 منافقین کی ریشہ دوانیوں کا سامنا کرنا پڑا تو کیا۔ اور کسی منزلِ تبلیغ  
 دین سے قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔

یہ علیؑ سلام ہی کا کلیجہ تھا کہ جاگے چھین گئی تلوار نہیں اٹھالی۔  
 یہ علیؑ سلام ہی کا جگر تھا کہ گلے میں رسی کا پھندا پڑ گیا اور سر نہیں اٹھایا۔  
 یہ علیؑ سلام ہی کا حوصلہ تھا کہ سر دربارِ زہرا کی توہین کی گئی اور بدعا  
 کے لیے ہاتھ نہیں اٹھائے۔ یہ علیؑ سلام ہی کا دل تھا کہ گھر میں  
 آگ لگادی گئی اور حملہ نہیں کیا۔

علیؑ وزہرا کے انہیں حوصلوں کی وارث بن کر ایک نسل سامنے آئی  
 جن میں دو دین کے ذمہ دار اور دو بھائیوں کے مقصد کی پاسبانِ ضمانت  
 دین امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے حصے میں آئی اور مقصدِ حسن و حسین کی اشاعت  
 زینبؑ و ام کلثومؑ کے حصے میں آئی۔

کائنات میں کسی انسان نے دین کی خاطر اتنی قربانیاں نہیں دیں  
 جتنی قربانیاں فاطمہ زہرا کو دینا پڑی ہیں۔ خلیلِ خدا نے ایک اسماعیلؑ  
 دیا تھا۔ آدم کو ایک بائبل کا داغ اٹھانا پڑا تھا۔ ایوب کو اپنے  
 ذاتی مصائب اٹھانا پڑے تھے۔ یونس کو خود شکمِ ماہی میں رہنا  
 پڑا تھا۔ موسیٰ کو خود دریاۓ نیل سے گذرنا پڑا تھا۔ عیسیٰ کو خود ستمِ یہود کا سامنا  
 کرنا پڑا تھا۔ لیکن فاطمہ زہراؑ؟ اپنے مصائب تو ایک طرف  
 گھرِ جلا و ارث کے گلے میں سٹی بندھی۔ جاگیر چھینی گئی۔ حق سے  
 محروم کیا گیا۔ پسلیاں توڑی گئیں۔ دروازہ پہلو پر گرایا گیا۔  
 شکم میں محسن کی شہادت ہوئی۔

اور اس کے علاوہ مالک نے فاطمہؑ کو چار اولاد دی۔ چاروں کو  
 دینِ خدا پر قربان کر دیا۔ حسنؑ کو زہرِ دغا کے لیے پیش کر دیا۔ حسینؑ کو  
 خنجرِ جفا کے لیے دیدیا۔ زینبؑ و ام کلثومؑ کو بازاروں اور درباروں  
 کے لیے پیش کر دیا۔ اور آواز دی میرے مالک! اگر تیرے دین کو  
 یہ بھرا گھر درکار ہے تو مالک! میرے حسنؑ کا کلیجہ حاضر ہے۔ میرے  
 حسینؑ کا گلہ حاضر ہے۔ میری زینبؑ کی ردا حاضر ہے۔ میری ام کلثومؑ کے بازو  
 حاضر ہیں۔ میرے محسن کی ننھی سی جان حاضر ہے۔ فاطمہؑ یہ سب کچھ دیدے گی لیکن  
 تیرے دین کی بربادی برداشت نہ کرے گی۔ اس دین کیلئے میرے بابا کی زندگی  
 مصائب کا شکار بنی ہے، اس دین کیلئے میرے وارث نے ہر مصیبت برداشت کی ہے۔  
 اس کیلئے میری ملیکہ العرب ماں نے فاقے کیے ہیں۔ اس دین کے لیے میرے

بزرگوں نے درختوں کے پتے چبا کر زندگی گذاری ہے تو میں اس کی بربادی  
کیونکر برداشت کروں گی۔

میرے مالک! تو گواہ رہنا یہ مصائبِ دلوں پر پڑتے تو شب  
تاریک کی طرح سیاہ ہو جاتے۔ یہ مصائب پہاڑ پر پڑتے تو ٹکڑے  
ہو جاتے۔ یہ مصائب خاصانِ خدا کو دیدیے جاتے تو دل لرز جاتے  
لیکن یہ تیری زہرا ہے جو شکوہ نہیں کرتی۔ تیری کینز ہے جو فریاد  
نہیں کرتی۔

مالک! گواہ رہنا۔ زہرا ہمیشہ خاموش نہیں رہے گی۔ تبلیغِ دین  
کی منزلیں ختم ہو جائیں گی، تو زہرا بولے گی اور تیری کینز تیری بارگاہ میں  
فریادی بن کر آئے گی۔

مالک! میں اپنی داستانِ میدانِ محشر میں سناؤں گی جب میرے  
ہاتھوں میں میرے عباس کے کٹے ہوئے ہاتھ ہوں گے، میری گود میں میرے  
اصغر کا لاشہ ہوگا۔ میرے پاس میرے حسین کا تیروں سے چھلنی پیرا ہن ہوگا۔  
اور میں تیرے عرش کا پایہ پیکر کر فریاد کروں گی۔ اے عادلِ حقیقی!۔  
فاطمہ تجھ سے انصاف چاہتی ہے، فاطمہ نے تیرے لیے سارا گھر لٹا  
دیا ہے۔ مالک! اب میں کچھ نہیں چاہتی۔ صرف ایک التجا ہے کہ  
میرے لال کے عزاداروں کو معاف کر دے۔

مالک! انھوں نے اس کا ماتم کیا ہے جس کے وارث اس کا ماتم  
نہیں کر سکے۔ مالک! انھوں نے اس کی صفِ عزا بچھائی ہے جس کی

ماں کر بلائے کے میدان میں نہ تھی کہ اپنے لال کی صفِ عزا بچھاتی۔  
 مالک۔ ! یہ انھیں کے آنسو ہیں جنہیں اپنے رومال میں جمع کر کے  
 لائی ہوں۔ یہ انھیں کے خونِ جگر کے قطرے ہیں جنہیں تیری بارگاہ  
 میں سمیٹ کر لائی ہوں۔

عزادارانِ حسین! کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس وقت محشر کا  
 کیا عالم ہوگا۔ فاطمہ کے بال کھلیں گے تو کیا منظر ہوگا۔ ہمیں تو اتنا  
 یاد ہے کہ کل وفاتِ پیغمبر کے بعد جب ان بالوں کے کھلنے کا ذکر آگیا تھا تو  
 مسجدِ پیغمبر کی دیواریں بلند ہو گئی تھیں۔

..... دخترِ پیغمبر نے سچ کہا تھا کہ اگر یہ مصائب دنوں پر پڑتے تو وہ  
 راتوں کی طرح سیاہ ہو جاتے۔ اس کا اندازہ تو کر بلا کے میدان میں ہوا  
 جب حسین کے گلے پر خنجر چل رہا تھا اور زمین کو زلزلہ مٹھا  
 آفتاب گہن میں چھپا ہوا تھا۔ . . . . فرات کی موجیں سر پٹک رہی  
 تھیں۔ سیاہ آنکھیاں چل رہی تھیں اور آسمان کے ستارے گریبان  
 چاک کر کے باہر آگئے تھے۔ زمین خون اُگل رہی تھی اور آسمان سے  
 خون کی بارش ہو رہی تھی۔

کاش کوئی باشعور ہوتا جو اندازہ کرتا کہ جب اس کائنات کی یہ حالت  
 تھی۔ جب زمین و آسمان زیر و زبر ہو رہے تھے تو اس فاطمہ کا کیا  
 حال ہوگا جس نے حسین کو پالا تھا۔ اس نبی کی کیا حالت ہوگی جس نے  
 حالتِ نماز میں اپنی پشت پر بیٹھایا تھا۔ اس علی کے دل پر کیا گزری

ہوگی جس نے محبت سے اس گلے کو بوسہ دیا تھا۔

رونے والو! دل کو نبھال سکو تو سناؤں — اور آنسوؤں  
کو روک سکو تو تمہارے ذہن کو اس منظر کی طرف لے چلوں — ایک لمحہ  
کے لیے تصور کر دو کہ حبیب حسینؑ کے گلے پر چلتا ہوا خنجر دیکھ کر کائنات منقلب  
ہو گئی تو جب خیمہ عصمت میں آگ لگی ہوگی — جب زہرا کی بیٹیوں کے  
سروں سے چادریں چھینی ہوں گی — جب سکیٹھ کے منہ پر طمانچے لگے ہوں  
گے، تو اس کائنات کا کیا حال رہا ہوگا۔

اور ایسی آنڈھیوں کے درمیان — ایسے گہن کے عالم میں جب  
رات آئی ہوگی تو وہ رات کتنی تاریک رہی ہوگی، اور اس رات میں ان  
بیکس سیدانیوں کا کیا عالم ہوگا جن کے جلے ہوئے خیموں میں شمعیں کسی میدوں  
کے چراغ بھی نہیں ہیں — جن کی خاکستر شدہ قناتوں پر نورِ قمر کیسا  
نور نظر کا سایہ بھی نہیں ہے — ہائے وہ شامِ غربیاں کا سناٹا —  
وہ کربلا کا جنگل اور وہ جنگل کا سکوت — وہ خیموں کے جلنے کی ہلکی ہلکی  
روشنی — وہ چاروں طرف وارثوں کے لاشے — وہ اصغرؑ کا  
خالی جھولا — وہ مدباب کی گود کی گرمی — وہ لیلیٰ کا دھڑکتا ہوا  
دل — وہ ام فروہ کا اضطراب — وہ قاسم و عون و محمد — اور  
عباسؑ و اکبرؑ کی یادیں اور وہ بیکس شہزادیاں — وہ جلتی ریتی اور وہ  
عابد ہیمار۔

کون ہے جو دلا سے دے — کون ہے جو پاسبانی کرے۔؟

کون ہے جو بیکیسی کے عالم میں لٹی ہوئی شہزادوں کے دلوں کو سہارا دے ؟  
 کوئی نہیں۔ صرف کربلا کی خاک ہے جو اڑا اڑا کر سروں کا پردہ  
 کر رہی ہے۔ رات کی تاریکی ہے جو چہروں کو نامحرموں کی نگاہوں سے بچائے  
 ہوئے ہے۔ بیکیسی ہے جو ماتم کر رہی ہے۔ تنہائی ہے جو آستو بہار ہجرت ہے۔  
 — ستانا ہے جو لوح خوانی کر رہا ہے — بھیانک جنگل ہے جو  
 غمگساری کا فرض انجام دے رہا ہے اور ایسے میں علیؑ کی بیٹی ہے جو ایک  
 ایک بی بی کو سمجھا رہی ہے۔ کبھی لیلیٰ کو ان کے لال کا پُرسہ دیتی ہے۔  
 کبھی ام فروہ کے ساتھ بیٹھ کر قاسم کا ماتم کرتی ہے۔ کبھی رباب کے  
 ساتھ اصغر کا ماتم کرتی ہے۔ کبھی فرات کی طرف نظر مڑ جاتی ہے، تو  
 عباسؑ کو یاد کرتی ہے۔ اور کبھی ہجوم مہائب سے ایک لمحہ کی  
 فرصت ملتی ہے تو اپنے حبیب کو یاد کرتی ہے۔ اور ایسے ہی میں کبھی  
 کبھی عونؑ و حمزہؑ کی یاد آواز دیتی ہے اماں — اسی مقتل میں ہم بھی ہیں  
 اماں آئیے، ہمیں بھی گلے لگا لیجیے — اماں — آئیے دولحہ کے لیے  
 ہمارے پاس بھی بیٹھ جائیے۔

ہائے زینب — خدا کسی کو ایسا بیکیس نہ بنائے جیسے زینبؑ  
 — کون تھا جو زینبؑ کو سہارا دیتا — ؟ کون تھا جو اس درد کا اندازہ  
 کرتا — ؟ کس کے پہلو میں ایسا دل تھا جو یتیموں کے غم کا احساس کرتا  
 — ہاں، روایت کا اشارہ ہے کہ ایک مرتبہ علیؑ کی بیٹی نے کسی کو آتے  
 ہوئے دیکھا — آواز دی، اے سوار ! ادھر قدم آگے نہ بڑھانا —

ہمارے بچے دکھ درد اٹھا کر سو گئے ہیں۔ ہمارے خیمے لٹ چکے ہیں۔  
ایسا نہ ہو کہ ہمارے بچوں کی نیند اُچٹ جائے۔ اگر تجھے کچھ لینا ہی ہے،  
تو صبح کو آ کر جو کچھ ہو لے لینا۔ اس وقت بچوں کو سولینے دے۔

علیٰ کی بیٹی فریاد کر رہی ہے اور سوار کچھ نہیں سُنتا۔ آگے  
بڑھنا چلا آتا ہے۔ ایک مرتبہ جیسے ہی سوار قریب آیا۔

شیر ذوالجلال کی بیٹی کو جلال آگیا۔ بڑھ کر لجام فرس پر ہاتھ ڈال دیا۔  
اے سوار میں بار بار کہہ رہی ہوں اور سُنتا نہیں ہے۔ ارے

میرا عباس شہید ہو گیا ہے، میرا اکبر مر گیا ہے، میرے عوں و محمد نہیں رہے  
میرا قاسم پامال ہو گیا ہے۔ تو کیا تو سمجھتا ہے کہ میں بالکل بے بس ہو گئی  
ہوں۔؟ میں علیٰ کی بیٹی ہوں۔ میرے پہلو میں شیر ذوالجلال کا دل ہے

یہ سُننا تھا کہ ایک مرتبہ سوار نے چہرہ سے نقاب اُلٹ دی۔  
ارے میری زینٹ تو نے پہچانا نہیں۔ میں تیرا باپ علیٰ ہوں علیٰ۔

باپ کا چہرہ دیکھتا تھا کہ بیٹی قدموں سے لپٹ گئی۔ بابا۔! اب  
آئے ہو جب گھر لٹ گیا۔ اب آئے جب خیمے جل گئے۔ اب آئے

جب چادریں چھن گئیں۔ اب آئے جب بھیا کے گلے پر خنجر چل گیا۔  
اب آئے جب سکینہ طلا بچے کھا کر سو گئی۔ اصغر کا جھولا ویران

ہو گیا، اور سیدانیاں بے والی و وارث ہو گئیں

وہ نہ قاسم نہ علی اکبر نہ عباس

باپ نے بیٹی کی داستان سنی۔ دل کو سنبھالا۔ آواز دی

زینبؓ۔! ٹھہرو ٹھہرو۔ بیٹی! دل کو سنبھالو۔ تم بیٹھو اب  
باپ نگرانی کرے گا۔

عزادارو! کون جانتا ہے کہ علیؑ کب آئے اور زینبؓ کی ذمہ داریاں  
کب ختم ہوئیں۔ ہاں مقتل میں اتنا ضرور ملتا ہے کہ اسی رات کے  
سنائے میں ایک مرتبہ زینبؓ اپنے بھیا کی امانت سکیٹہ کو تلاش کرنے  
نکلے تھی اور جب ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک نشیب کے قریب پہنچی  
تھی تو وہاں سے کسی بچی کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ جناب زینبؓ اور  
جناب ام کلثومؓ آگے بڑھیں، کیا دیکھا۔ سکیٹہ ایک لاشہ بے سر سے لپٹی  
ہوئی بن کر رہی ہے۔ بابا۔! میں لٹ گئی۔ بابا۔! میں تم سے  
چھٹ گئی۔ بابا۔! گوشوارے چھین گئے۔ بابا۔! ذرا اٹھ کے دیکھو  
یہ رخسار شمر کے طمانچوں سے نیلے ہو گئے ہیں۔

ثانی زہراؓ آگے بڑھیں۔ بچی کو اٹھایا۔ پوچھا۔ سکیٹہ یہ کس  
کا لاشہ ہے۔؟ کہا پھوپھی اماں! یہ میرا بابا ہے۔ کہا بیٹی  
اس لاشہ پر تو سر بھی نہیں ہے۔ اس کا لباس بھی لٹ گیا ہے۔ تو  
نے کیسے پہچانا۔؟ کہا۔ پھوپھی اماں جب رات کی تاریکی نے ستایا  
تو میں مقتل میں بابا کو ڈھونڈتی ہوئی آئی۔ آواز دے رہی تھی۔  
بابا۔! تمہاری سکیٹہ آرہی ہے۔ بابا، کہاں ہو بابا۔ اپنی سکیٹہ  
کو اپنے پاس بلالو۔ ایک مرتبہ اس لاشہ بے سر سے آواز آئی۔  
اؤ سکیٹہ آؤ۔ تیرا بابا اس نشیب میں ہے۔ پھوپھی اماں!

